Individualland
Where the individual counts

فرد

شمارہ نمبر ۱ مئی ۲۰۱۱ء

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

کے تعاون سے

فرد

شمارہ نمبر ۱ مئی ۲۰۱۱ء

فہرست

ایڈیٹر کے ڈیسک سے۔۔۔۔	۳
میڈیا اور اس میں ذمہ داری کا فقدان	۴
مسلح لڑائیوں کی میڈیا کوریج: اخلاقیات کے بغیر ذمہ داری ناپید ہے	۶
مذہبیت کا دائرہ کار	۸
صحافت میں متبادل کی تلاش	۱۰
سوات کو انتہا پسند بنانے میں مواصلات کا کردار	۱۲
لبرل نکتہ نظر	۱۴
حقیقت کیا ہے؟	۱۶
تبلیغِ فریب	۱۸
تنازعات کے خواتین پر اثرات	۲۰
بے ربط نوجوان	۲۳
سماجی میڈیا میں دہشت گرد	۲۶
واقعات کی رپورٹ: مسلح جھگڑوں کی صورت احوال میں میڈیا کے کردار کے بارے میں گول میز کانفرنس	۲۸

ایڈیٹر:
مہر خان

پبلیشر:
انڈیویجوئل لینڈ پاکستان

کارٹونسٹ:
اختر شاہ

Individualland
Where the individual counts

House # 12-B, St. # 26, F-8/1, Islamabad.

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT

کے تعاون سے

ایڈیٹر کے ڈیسک سے۔۔۔۔

پاکستان کے موجودہ حالات پر ایک طائرانہ نظر مجھے یہ یاد دلاتی ہے کہ پاکستان کتنا منفرد ملک ہے اور اب یہ کتنی نازک صورتحال سے دوچار ہے۔ جب میں 1990ء کی دہائی میں گریجویشن کیلئے گئی تو یہ ایک گونا گوں ثقافت کا حامل معاشرہ تھا اور تمام پاکستانیوں کو اپنی ثقافت پر فخر تھا جو صدیوں سے ایک گلدستے کی مانند چلا آ رہا تھا جس میں چاروں صوبوں کے مخصوص رنگ بھرے ہوئے تھے نیز اس میں نیم خانہ بدوش مقامی قبائل آباد تھے جو قدیم شاہراہ ریشم اور برصغیر میں پاکستان اور افغانستان کے سرحدوں پر گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔ طبقاتی تقسیم اور تعصّبات موجود ضرور تھے لیکن معاشرہ تنازعات سے پاک تھا۔

افغانستان پر سوویت قبضے اور بعد میں انخلاء کے بعد جس کے دوران ایک پوری نسل پروان چڑھ گئی، میرے وطن میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا۔ پاکستان کی شمال مغربی سرحدوں پر ایک صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رہنے والا تنازعہ بین الاقوامی رنگ اختیار کر گیا اور جناح کا پاکستان ہمیشہ کیلئے تبدیل ہو کر رہ گیا۔

پاکستان جو کہ ایک اسلامی فلاحی ریاست کے طور پر وجود میں آیا ان واقعات کے پیش نظر شدت پسندی اور تنازعے کی پناہ گاہ بننے کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

نائن الیون کے بعد اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں اس کی تشہیر کے نتیجے میں دہشت گردی کے خلاف جنگ پاکستان اور افغانستان کی سرحدوں تک آن پہنچی۔ اس وقت سے لے کر آج تک مقامی ذرائع ابلاغ پاکستان کو درپیش داخلی اور خارجی دونوں قسم کے چیلنجوں کو مسلسل اجاگر کر رہے ہیں۔

ڈنر ٹیبل پر بیٹھ کر ہم ملک کی موجودہ صورتحال پر بحث مباحثہ کرتے ہیں کہ معاشرے میں جاری کشمکش بد سے بدتر ہو رہی ہے یا نہیں لیکن ہم نے کبھی جنگ کے صورتحال پر یا اس کے دوران حالات و واقعات کی کوریج کے حوالے سے ذرائع کے کردار کا کبھی جائزہ لیا ہے؟ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہم بحیثیت قوم ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں عام آدمی معاشرے میں جنم لینے والی ناانصافیوں اور بنیادی حقوق کے بارے میں بات کرنے سے خوفزدہ ہے کیونکہ اسے مذہبی تقاضوں و اصولوں کے برعکس تصور کیا جاتا ہے۔ سوال جو پوچھا جانا چاہیے، یہ ہے کہ یہ سوچ کیسے پیدا ہوئی۔ اس تصور کو پیدا کرنے میں اگر ذرائع ابلاغ نے کوئی کردار ادا کیا تو وہ کیا تھا؟

یوم آزادی صحافت کے موقع پر ہم اپنے میگزین کو اس سال کے ضمنی موضوع ''پاکستان میں ذرائع ابلاغ اور تنازعات'' کے حوالے سے ذرائع ابلاغ کی آزادی اور ذمہ داری پر بحث کیلئے وقف کر رہے ہیں۔ یہ سال میں دو مرتبہ شائع ہونے والے ہمارے میگزین کا پہلا شمارہ ہے۔ یہ میگزین کشادہ دلی کے ساتھ منظر عام پر لایا جا رہا ہے جس میں ماہرین نے مسلح جنگوں کے بارے میں ذرائع ابلاغ کی کوریج پر سیر حاصل بحث کی ہے نیز یہ کہ کوئی ضابطہ اخلاق اور احساس ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے ذرائع ابلاغ کی رپورٹنگ پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس میں ایسے سوالات مثلاً کیا ذرائع ابلاغ جنگوں کی خبریں دیتے ہیں، جنگوں کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں، کشیدگی کم کرتے ہیں، کشیدگی پیدا کرتے ہیں یا جنگ میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں، کا احاطہ کیا گیا ہے۔

ہماری دانست میں ذرائع ابلاغ اور قارئین کو ایک دوسرے کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیے۔ جہاں ذرائع ابلاغ کے بارے میں توقع کی جاتی ہے کہ اسے آزادانہ اور ذمہ دارانہ رویے کا حامل ہونا چاہیے وہیں قارئین میں بھی منظّم، ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنے اور اپنے مسائل کو واضح کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ ذرائع ابلاغ کی حساسیت اور خواندگی کی ذمہ داری رپورٹر سے لے کر ایڈیٹر اور میڈیا کی نمایاں شخصیات سب پر یکساں لاگو ہوتی ہے۔

ذرائع ابلاغ کو کسی بھی تنازعے میں فریق نہیں بننا چاہیے کیونکہ جب ذرائع ابلاغ کسی معاملے میں فریق بن جاتے ہیں تو یہ خود ان کیلئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ جب ہم قومی اور بین الاقوامی سطح پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک آزاد اور روشن خیال جمہوری ریاست ہیں تو ہماری ذرائع ابلاغ کیلئے اس بات کی ضرورت دوچند ہو جاتی ہے کہ وہ چیلنج قبول کرتے ہوئے ذمہ داری کا مظاہرہ کریں اور رپورٹنگ میں اخلاقیات کو مقدم رکھیں۔ ہمارے خیال میں ایک ایسا قاری جو ذرائع ابلاغ کی نزاکتوں سے بخوبی آشنا ہے ایک آزاد و ذمہ دار اور لفاظی و غیر ذمہ دار ذرائع ابلاغ کے مابین فرق محسوس کر سکتا ہے۔

ہم ان تجربہ کار مصنفین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیں گے جنہوں نے انڈیوجول لینڈ کے لئے خصوصی طور پر وقت نکالا اور فقط فرد میگزین کے پہلے شمارے کیلئے اپنی تصانیف بھیجیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو سال کے بقیہ عرصے کے دوران خوش اور محفوظ رکھے

مہر خان

میڈیا اور اس میں ذمہ داری کا فقدان

از: مہمل سرفراز

جنوری 4، 2011 کا دن ایک لمبے عرصے تک پاکستان کو خوف میں مبتلا رکھے گا۔ ٹیلی ویژن اسکرین پر اس روز رونما ہونے والے خوف ناک مناظر کچھ ایسے تھے جو میں یاد رکھنا نہیں چاہوں گی اور خواہش کروں گی وہ کسی صورت درست نہ ہوں۔ پہلے تو یہ خبر آئی کہ گورنر پنجاب سلمان تاثیر کو گولی مار دی گئی۔ میں نے بے چینی میں اپنے دیگر صحافی دوستوں کو فون کرنے شروع کئے تا کہ یہ جان سکوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ چند منٹوں کے بعد یہ خبر فلیش کی گئی کہ تاثیر صاحب دنیا میں نہیں رہے۔

تین ماہ قبل، ہم نے تاثیر صاحب کو مذہبی انتہا پسندوں کے ہاتھوں کھو دیا۔ گزشتہ ماہ، ہم نے ان ہی لوگوں کے ہاتھوں وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور شہباز بھٹی کو کھو دیا۔ دونوں حضرات کو دن دہاڑے قتل کیا گیا؛ تاثیر صاحب کو ان کے اپنے باڈی گارڈ نے قتل کیا، شہباز بھٹی حملے میں اس لئے نہ بچ پائے کہ ان کے قتل کے وقت ان کی حفاظت کے لئے کوئی سیکورٹی موجود نہیں تھی۔ تاثیر صاحب کے قتل نے بہت سے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا لیکن بھٹی صاحب کے قتل نے ہم سب کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ ہم ایک بات یقینی طور پر جانتے ہیں: اب یا کبھی نہیں۔ ہم کب تک دائیں بازو کی قوتوں اور دہشت گردوں کے ناپاک عزائم کے ہاتھوں یرغمال بنتے رہیں گے؟ دائیں بازو کے لوگ کبھی باہر نکل کر دہشت گردوں کی مذمت نہیں کریں گے۔ دہشت گرد ایک کے بعد دوسرے کو قتل کرتے رہیں گے۔ جب کہ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں، تو ادھر ایک اور قوت بھی موجود ہے جو ان کی مدد اور ان کے ساتھ تعاون کرتی ہے، وہ ہے میڈیا (ذرائع ابلاغ)۔

پرنٹ میڈیا (اخبارات) تو ایک حد تک موثر ہے لیکن پاکستان میں شرح خواندگی خاصی کم ہونے کی وجہ سے عوام کی ایک اچھی خاصی تعداد اخبارات نہیں پڑھ پاتی۔ لیکن مشرف کے دور حکومت میں ملک میں نجی نیوز چینلز کی بھرمار نے میڈیا کے اثر و رسوخ میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے کہ جہاں تک مختلف مذاہب پر مبنی معاشرے اور مختلف پالیسی مسائل کا تعلق ہے الیکٹرانک میڈیا نے اپنے میدان، رسائی اور مواد کو وسیع کر لیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ پروگراموں اور ٹاک شوز میں مذہبی فرقوں اور اقلیتوں کے خلاف تشدد پر ابھارنے کے بارے میں تشویش پر بھی بات کر لینی چاہیئے۔ چند باعزت مواقع کو چھوڑ کر، پاکستان کا میڈیا دائیں بازو کے لوگوں کے زیر اثر ہے جو یا تو مذہبی جنونیت کی حمایت کرتے ہیں یا ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ میڈیا واچ ڈوگ کا کردار ادا کرنے کی بجائے، ایک جانب سراغ رساں اداروں کی زبان بول رہا ہے تو دوسری جانب دہشت گردوں کی۔

2008 میں الیکٹرانک میڈیا کے کردار کے بارے میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں، ایک بزرگ صحافی حسین نقی ایک بڑا دلچسپ مقالہ پیش کیا جس کا عنوان 'الیکٹرانک میڈیا: اخلاقی ضوابط اور عوامی دلچسپی' تھا۔ اس مقالے میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ، ''اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ پرائم ٹائم میں نشر کئے جانے والے پروگراموں کے مواد میں بڑے پیمانے پر ایسی باتیں شامل کر دی جاتی ہیں جو تعصب، نفرت، مخالفت پر ابھارتی ہیں اور دوسرے لوگوں کے ایمان کا مذاق اڑاتی ہیں . . . کچھ سنگین جرائم کی تعریف اور مذہبی پابندیوں کا دعویٰ کرتے ہوئے ان کا برملا پروپیگنڈہ بھی الیکٹرانک میڈیا پر جاری ہے۔ فرقہ وارانہ تشدد کی غیر متوازی کوریج، جس سے کسی طبقے کو اکسائے جانے کا تاثر مل سکتا ہو اور جن سے تشدد میں مزید اضافہ ہونے کا امکان ہو، کا دھیان نہیں رکھا جاتا۔ اقلیتی کمیونٹیوں، عورتوں اور بچوں سمیت معاشرے کے ناتواں طبقات کے حقوق اجاگر کرنے سے گریز کیا جاتا ہے۔ ایک ہی طرح کے پروگرام پیش کرنا معمول بن چکا ہے اور صرف چند ہی ایسے چینلز ہیں جو حساس مواد کی تیاری میں پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے ایڈیٹروں کی ضرورت کو نظر انداز کرتے ہیں۔''

مرحوم گورنر سلمان تاثیر آسیہ بی بی کے ہمراہ، جنہیں ناموس رسالت کے قانون سے متعلق غلط فہمی کی بنیاد پر قتل کر دیا گیا۔ ماخذ: ڈیلی گراف، نومبر ۲۰۱۰

سنگین جرائم کی تعریف کی ایک بڑی مثال سلمان تاثیر کے قتل میں ملتی ہے۔ ان کے قتل سے پہلے، تاثیر صاحب کو میڈیا میں ایسے اینکر پرسنز کی جانب سے غلط طور پر شاتم الرسل کی حیثیت سے پیش کیا گیا جو محض نمبر ٹانگنے کے چکر میں ذمہ دار صحافیوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو بھلا بیٹھے تھے۔ ایک انداز میں، میڈیا تاثیر صاحب کے خلاف

لوگوں کے جذبات بھڑکانے کا ذمہ دار ہے جو آخر کار ان کی موت پر منتج ہوئے۔ اور جس انداز میں ان کے قاتل، ممتاز قادری کی شان میں تعریف کے پل باندھے گئے وہ نہ صرف شرمناک بلکہ صریحاً قابل نفرت ہے۔ ایک ایسا شخص جس نے ایک بے گناہ فرد کا سفاکانہ قتل کیا تھا اسے مرنے والے کی نسبت زیادہ ایئر ٹائم دیا گیا اور ٹیلی وژن پر پروگرام پیش کرنے والوں نے اس کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی۔ یہ اس بات کی صرف ایک مثال ہے کہ کس طرح ہمارا میڈیا انتہا پسند ذہنیت رکھنے والوں کی تعریف کرتا ہے۔

یہ سب کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام میڈیا انتہا پسندی اور دہشت گردی کو فروغ دیتا ہے۔ مسلح جھگڑوں سے متاثرہ خطوں میں کچھ صحافیوں کی جانب سے بڑی ہمت اور ملک سے وفاداری کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اور ان میں کچھ ایسے صحافی بھی ہیں جنہوں نے بڑے بڑے خطرات کا سامنا کرتے ہوئے پابندی والے علاقوں میں کچھ غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے میڈیا کو کامیابی سے ہم کنار کیا ہے۔ تاہم، پھر بھی حالات حاضرہ کے زیادہ تر پروگراموں، خبروں کی کوریج، ایڈیٹروں کو نکال باہر کرنے اور انہیں تنگ کرنے اور ادارتی کنٹرول اور آزادی کو سلب کرنے کے واقعات نے ادارتی اور معیاری کنٹرول کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن دونوں نیٹ ورکس پر عوامی خدمت اور معلوماتی پروگراموں کی کمی بھی میڈیا کی ذمہ داری نہ نبھانے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ پرنٹ اور الیکٹرانک، دونوں میڈیا میں، حقائق کی بجائے انداز بیان اور معاشی، سیکورٹی اور خارجہ پالیسی کے بجائے معقول اور عملی کی بجائے جا گیرداری عزت واقدار پر انحصار بڑھتا جا رہا ہے۔ نام نہاد ماہرانہ رائے مولویوں کے بہت زیادہ شرکت اور پیشہ ورانہ مہارت کی کمی کی وجہ سے بے ربط نظر آتی ہے۔ ڈرون حملوں کے معاملے میں جو طالبان اور القائدہ کے رہنماؤں اور ارکان کو ہلاک کرتے ہیں، میڈیا کی پوری توجہ حکومت، امریکیوں اور فوج پر ہوتی ہے جب کہ دہشت گرد اپنی بربریت کے باوجود متاثرین کے طور پر تعریف کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔

میڈیا اب ایک مشن نہیں رہا؛ اب یہ محض ایک صنعت بن کر رہ گیا ہے۔ میڈیا کے اداروں نے اپنے آپ کو ایک تنظیمی ڈھانچے میں تبدیل کر لیا ہے۔ میڈیا صنعت کے اداروں کی تنظیمی ذمہ داری ہونی چاہیئے، لیکن ہمیں یہ ذمہ داری بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ میڈیا رواداری، جمہوری ثقافت، انسانی حقوق کے احترام بشمول عورتوں اور اقلیتوں کے حقوق، دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کو تنہا کرنے میں لوگوں کے دل و دماغ کو جیتنے، امن، قانون کی پاس داری اور اچھی حکمرانی کے لئے واضح پیمانے مقرر کرے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں کو ادارتی ادارے، معیار کے کنٹرول اور سماجی ذمہ داریوں کو مضبوط کرنے کے لئے ایک ایسے ضابطہ اخلاق پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے جسے تمام بڑی تنظیمیں تسلیم کرتی ہوں اور میڈیا کے ہر ادارے میں آگہی رکھنے والے ایک آزاد محتسب کا تقرر ہونا چاہیئے۔ وقت آ گیا ہے کہ پاکستانی میڈیا زیادہ ذمہ داری کا ثبوت دے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کہ ایک درست سمت کی جانب پیش قدمی کی جائے، یہی ایک مناسب راستہ ہے۔

مصنفہ: مہمل سرفراز "ڈیلی ٹائمز" میں Op-Ed ایڈیٹر، اور میڈیا میں جنوبی ایشیاء خواتین کی جنرل سیکرٹری ہیں۔ ان سے info@individualland.com پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

مسلح لڑائیوں کی میڈیا کوریج: اخلاقیات کے بغیر ذمہ داری ناپید ہے

از: عدنان رحمت

پاکستان میں نئے ملینیم کی پہلی دہائی مختلف معیار کی حامل مشکل دہائیوں سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہوئی ہے۔ ملک نے اپنے آپ کو، کبھی ایک کھلاڑی کے طور پر اور کبھی ایک متاثرہ ملک کی حیثیت اور کبھی ان دونوں حیثیتوں میں، دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلح لڑائیوں اور جنگ کے سب سے بڑے تھیٹر میں گھرا ہوا پایا۔

9/11 کے بعد کے عرصے میں کچھ ایسے دلچسپ واقعات رو پذیر ہوئے اور متوازی باتیں ہوئیں جنہوں نے دنیا کے لئے دہشت گردی کے تصور کو ہمیشہ کے لئے تبدیل کر دیا اور یہ طے کر دیا کہ کس طرح مسلح لڑائی اور جنگ کو ملک کے اندر اور باہر رپورٹ کرنا چاہیے۔

پہلے تو، دہشت گردی میں اضافے اور اس کے پاکستانیوں کی روزمرہ کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات ایک ایسے ہی عرصمیں رو پذیر ہوئے جس میں آزاد میڈیا (ذرائع ابلاغ) کے تصور نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب 9/11 کا واقعہ پیش آیا تو اس وقت ملک میں صرف ایک ٹی وی چینل اور محض ایک ریڈیو اسٹیشن ہوتا تھا - دونوں حکومت کی ملکیت تھے۔ اب ملک میں حالات حاضرہ کے 30 سے زائد 24/7 ٹی وی چینلز اور 140 سے زائد ایف ایم ریڈیو اسٹیشن موجود ہیں۔ لہٰذا اس مسلح لڑائی کی کوریج کی بہتری یا خرابی کی تشریح، پاکستان کے شہریوں اور دنیا دونوں کے لئے کی گئی ہے۔

دوسرے، پاکستان میں آزاد نشریاتی شعبے کی افزائش - درجنوں نجی ٹی وی چینلز اور ریڈیو اسٹیشنز - میں مسلح لڑائی کے پھیلتے ہوئے تھیٹر کی وجہ سے تیزی آئی ہے اور اس طرح اس کے بعد سے دہشت گردی اور مسلح لڑائی کی خبریں مسلسل نیوز بلیٹن کی سب سے پہلی خبر کے طور پر نشر کی جاتی ہیں۔ یہاں تک کے پاکستان میں دہائی کی سب سے بڑی خبر - 2008 کے عام انتخابات جن کی وجہ سے ملک میں فوجی حکمرانی سے منتخب جمہوریت کی جانب منتقلی میں مدد ملی - بھی بے نظیر بھٹو کے غم زدہ قتل کی صورت میں ہونے والی ہشت گردی کی بنا پر گہنا گئی۔

تیسرے، اسی عرصے میں میڈیا کے شعبے میں پھیلاؤ کے نتیجے میں میڈیا میں کام کرنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ دیکھنے میں آیا - 2,000 سے موجودہ 17,000 تک ۔ رپورٹرز کی تعداد میں اضافہ ہونے سے، ان کی عمر بھی اب کم ہو کر 47 سے تقریباً 23 رہ گئی ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی مسلح لڑائی نے بڑھتی ہوئی کوریج کو ہوا دی ہے، جو ماضی کے چند سالوں میں سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، اور سرائیکی سمیت مقامی زبانوں میں کی جاتی تھی۔ دہشت گردی کی کوریج کسی ایسے واقعے کے بعد، منٹوں میں براہ راست دکھا دی جاتی ہے - اور کبھی کبھار صرف سیکنڈوں میں - جو ہیجان، گھبراہٹ اور ذہنی دباؤ میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ گزشتہ کئی برسوں میں جیسے جیسے پاکستان میں دہشت گردی بڑھی اور مسلح لڑائی میں تیزی آئی، میڈیا کی بردباری میں کمی آتی گئی، جس سے جانب دارانہ طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ کیوں مسلح لڑائی کی کوریج کم تجزیاتی اور رائے پر زیادہ مبنی، واقعے پر زیادہ متوجہ اور مواد پر کم مبنی ہوگئی ہے۔

ایلزبتھ ریحان اور ایلین سریف اپنی کتاب 'خواتین، جنگ اور امن' میں کہتی ہیں، ''مسلح لڑائی اور جنگوں میں میڈیا کی طاقت بہت ہیبت ناک ہے۔ یہ ایک ثالث یا ایک ترجمان ہوسکتا ہے، یا لڑائی میں مددگار بھی ثابت ہوسکتا ہے۔'' پاکستان میں آزاد میڈیا کے پھیلاؤ سے حالیہ دنوں میں مسلح لڑائی کی رپورٹنگ نے اس مشاہدے کی تصویر کشی کر دی ہے۔ اسلام آباد میں 2007 کی تپتی گرمیوں میں لال مسجد کا محاصرہ پہلی ایک ایسی مثال تھی جب میڈیا نے لڑائی کی صورت حال میں اکثر سرکاری حکام اور مسجد کے اندر پھنسے ہوئے جنگجوؤں کو اہم اوقات میں براہ راست کوریج دیتے ہوئے، اپنے لئے سرگرمی سے خود بخود 'ثالث' کا کردار طے کر لیا تھا۔

عوام کو ایک بڑی سطح پر سرکار اور اس کے عوام کے خلاف بغاوت کرنے والے جنگجوؤں تک رسائی کے لئے ایک باقاعدہ پلیٹ فارم پیش کرتے ہوئے، اور دونوں اطراف کے درمیان سرگرمی سے ثالثی کا کردار ادا کرتے ہوئے، میڈیا کہانی کی رپورٹنگ اور تجزیہ کرنے کی بجائے خود اس کہانی کا حصہ بن گیا۔ یہ میڈیا کی غیر جانب داری پر اصولی زور دینے کے برخلاف ایک صورت حال تھی۔

اس طرح دہشت گردی کی کوریج کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں پر ایک متفقہ لائحہ عمل ترتیب دینے میں میڈیا ناکام رہا ہے - عوام کی آنکھوں کا تارا بننے اور صارفین کے حلقوں میں پذیرائی حاصل کرنے کے سخت مقابلے نے سنسنی خیزی میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا ہے - جس کی وجہ سے گزشتہ دو برسوں میں دہشت گرد گروپوں نے دراصل اپنی پر تشدد حرکات کے اثرات کو بہتر بنانے میں میڈیا کو بڑی آسانی سے اپنے مطابق چلایا ہے۔

پاکستان میں دہشت گرد گروپ ''میڈیا تقریبات'' کا اہتمام کر رہے ہیں - حملوں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ: (1) میڈیا کوریج، جو کہ تقریباً فوری طور پر عمل میں آجاتی ہے - لہٰذا حملے عموماً ایسے علاقوں میں کئے جاتے ہیں جہاں میڈیا کے دفاتر یا سہولتیں موجود ہوں، جیسا کہ پشاور اور اس کے مضافات، لاہور، اسلام آباد، راولپنڈی، کوئٹہ جیسے بڑے شہر وغیرہ، اور (2) میڈیا کوریج جو جاری ہے اور کئی گھنٹوں تک پھیلی ہوئی ہے - چنانچہ حملے زیادہ تر صبح، دوپہر یا شام کے مصروف ترین اوقات میں کئے جاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اموات ہوں اور آبادی میں بے چینی پیدا ہو اور لوگ اپنے خاندان کی ارکان کی خیریت اور محل وقوع جاننے کے لئے تڑپیں، یا لاہور میں ہونے والے حالیہ سیریل دھماکوں کی طرح جن کا مقصد میڈیا کو ایک مختصر وقت میں ایک جگہ سے دوسرے جگہ بھاگنا پڑے اور اسکرین پر پھیل جانے والی میڈیا کی بے چینی کو استعمال کرتے ہوئے لاکھوں لوگوں کو آسانی سے خوف زدہ کیا جاسکے۔

آج پاکستان میں میڈیا کو درپیش ایک اہم چیلنج 'دوسری نسل' میڈیا کو پیشہ ور بنانے میں اداروں کی بے توجگی ہے۔ پاکستان میں 'پہلی نسل' میڈیا کی اصلاحات نے میڈیا کو ورثے میں اختیارات میں اضافہ، میڈیا مالکان کے مفادات اور میڈیا میں کام کرنے والوں کی تعداد عطا کی ہے۔ یہ عمل بہت کامیاب رہا ہے۔

دوسری نسل کی اصلاحات اچھی طرح اپنی جگہ نہیں بنا سکیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ (1) میڈیا کی تصوراتی مہارت تشکیل دی جائے (وہ رپورٹر جو کسی مخصوص مضامین میں مہارت رکھتے ہیں اپنے اپنے شعبوں سے منسلک رہیں اور اس بات کا علم رکھتے ہوں کہ وہ کیا بات کر رہے ہیں)، (2) میڈیا کی تکنیکی استعداد میں اضافہ کیا جائے (واقعات کی رپورٹنگ میں تخلیقی عنصر پیدا کیا جائے نہ کہ معلومات پھیلانے کے عمل میں کسی بھی چیز کو کسی بھی طریقے سے براہ راست کوریج کو طول دینے کی خاطر تضحیک کا انداز اپنایا جائے)، اور (3) میڈیا کے پیشہ ورانہ اصولوں کو بہتر کیا جائے (عام طور پر دہشت گردی کے واقعات کی رپورٹنگ اور خصوصاً ایسے واقعات کی براہ راست کوریج میں اخلاقیات کا استعمال جو خوف، دہشت اور مایوسی پیدا کرتے ہوں)۔

آج کل پاکستان میں مسلح لڑائی کی کوریج کے لئے ہیجان انگیز اور غیر تجزیاتی طرز عمل صرف میڈیا کو مشتعل کرسکتا ہے۔ ملک کے نوجوان، بے چین اور خشک مزاج میڈیا کی پیشہ ورانہ استعداد کی تشکیل کے لئے مختلف اقسام کی بہت سی تربیت کی ضروری ہے۔ اس کے بغیر، یہ محض نہ صرف عام طور پر غیر پیشہ ور رہیں گے (بہت سی ایسی چیزوں کے باوجود جو اس کے ساتھ صحیح ہیں اور نیک تمنائیں بھی پیدا کرسکتی ہیں) بلکہ تنزلی کا شکار ہوکر مختصر شکل اختیار کرسکتے ہیں، جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔

پاکستانی میڈیا کو دہشت گردی کی مضحکہ خیز تصویر پیش کرنے یا کسی ایسی حکایت کو زیادہ سادہ بنانے سے گریز کرنا چاہیئے جو کسی موضوع کے بارے میں کسی ایسے مسئلے کو رپورٹ کرنے کے لئے ضروری ہو جو اس کے تصور کو گہرا کرتی ہو۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ پاکستان میں کسی حد تک میڈیا نے لوگوں اور حکومتی حلقوں کی مدد کی ہے تاکہ وہ دہشت گردی اور اسلام کو الگ رکھ سکیں۔ میڈیا نے اس عنوان پر بات چیت میں اضافہ کرتے ہوئے اسلام کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے عمل سے پردہ اٹھایا ہے۔ لیکن تصوراتی میدان میں اب اس مسئلے کے انسانی پہلو پر زور دینے کی ضرورت ہے تاکہ اس پر مکمل طور پر قابو پایا جاسکے۔

میڈیا ان-ہاؤس اور زیادہ پیشہ ورانہ مجموعی کوشش کے ساتھ اپنی توجہ دہشت (نتیجے کا ایک پہلو) سے دہشت گردی (اس کے اثر کا ایک پہلو) کی جانب موڑ سکتا ہے۔ وہ تین نہایت اہم ہتھیار جن کی پاکستانی میڈیا کو مسلح لڑائیوں کی ذمہ دارانہ رپورٹنگ کی جنگ لڑنے میں ضرورت ہے، یہ ہیں: (1) اخلاقیات، (2) اخلاقیات اور (3) اخلاقیات۔

مصنف: عدنان رحمت انٹرمیڈیا نامی ادارے کے کنٹری ڈائرکٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں اور تنازعات سے متعلق موضوعات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

مذہبیت کا دائرہ کار

از: محمد عامر رانا

پاکستان میں مذہب کے متعلق بحث میں وسیع پیمانہ پر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ اس بحث کے دوران تغیر اور اختلاف دیکھنے میں آتا ہے لیکن حتمی طور پر مقصد میں یکجہتی نظر آتی ہے۔ فرقہ وارانہ بنیادوں پر اختلاف کے باوجود مذہب کے دائرہ کار میں عالمی حالات، سماجی و معاشی اور سیاسی آراء میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

پاکستان میں مذہبی سیاسی جماعتیں ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان سے ہی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مصروف عمل ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد ریاست کے اندر اسلام کا نفاذ ہے۔ جس کے تحت معاشرے میں مذہبی اصولوں کو فروغ دینا ہے۔ اسلامی نفاذ کے لیے ان کی سب سے بڑی کامیابی 1949 میں قرار داد مقاصد کے ذریعے ریاست کے نظریاتی تشخص کا بیان کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان جماعتوں نے اس بات کو بھی تسلیم کروایا کہ خدائی قوانین پارلیمنٹ کے بنائے گئے قوانین سے فوقیت رکھتے ہیں۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے جنرل ضیاء الحق کے دور میں انہوں نے اسلامی قوانین کے نفاذ کو یقینی بنالیا۔

ان تمام اہم کامیابیوں کے باوجود مذہبی جماعتیں ریاست میں مکمل اسلامی نظام کے قیام کے لیے بدستور جدوجہد کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مذہبی سماجیت کی ایک اور بحث کو فروغ دے رہے ہیں۔ جو ان کے سیاسی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگی رکھتی ہے اور جب سے معاشرے میں واضح مذہبی و معاشرتی میلان دیکھنے میں آرہا ہے ان کے مقصد کے لیے گزشتہ کامیابیاں نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔ مذکورہ دونوں مذہبی مباحث کا بنیادی مقصد زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کو نافذ کرنا ہے۔ جو درج ذیل چھ متغیر حرکات کے امتزاج سے واضح ہوتا ہے:۔

1۔ سیاسی طور پر اسلام کا نفاذ۔ 2۔ جدت پسند تحریکیں۔ 3۔ صوفی ازم۔ 4۔ تبلیغ اور دعوت۔ 5۔ فرقہ واریت اور 6۔ عسکریت پسندی۔

یہ تمام تغیراتی پہلو ملک میں اہم بڑی مذہبی تنظیموں یا تحریکوں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور اکثر اوقات ایک دوسرے کے ساتھ مرکب ہوتے ہیں۔ نظریات اور مذہبی مباحث کی پیچیدگی متعدد اندرونی اختلافات کو جنم دیتی ہے۔ اور یہ معلوم ہونا مشکل دکھائی دیتا ہے کہ یہ تنظیمیں اپنے کردار کو کیسے دیکھتی ہیں اور اپنے دائرہ اختیار کو کیسے وضع کرتی ہیں۔ یہی بات ان کے درمیان اختلافات کو اجاگر کرتی ہے، جو ان کے عہدیداروں کے درمیان تقسیم در تقسیم پیدا کرتی ہے۔ اس وقت پاکستان میں تقریباً 247 مذہبی تنظیمیں جو بظاہر ایک ہی مقصد رکھتی ہیں، کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم ہیں۔ لیکن جب ان کے مفادات آپس میں ملتے ہیں تو اکٹھے کام کرنے پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔

تقریباً آخری دو دہائیوں سے پاکستان میں ایک اور طرح کی مذہبی تنظیمیں معرض وجود میں آئی ہیں۔ یہ قسم بھی ملک کے اندر اسلامی نظام اور مذہبی معاشرتی ملاپ چاہتی ہیں۔ مگر وہ اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ ملک کے موجودہ سیاسی نظام کے تحت کام کرنے سے کسی قسم کی بھی تبدیلی لانا ناممکن ہے۔ اس قسم کی تنظیمیں جمہوریت اور جمہوری طریقہ کار کو متبادل نظام لانے کے لیے رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی ہیں جو جمہوریت کو ہی خلاف اسلام گردانتی ہیں اور اس کی جگہ خود ساختہ شریعتی نظام لانا چاہتی ہیں۔ ان جماعتوں میں جماعت الدعوۃ، تحریک خلافت، حزب التحریر اور المہاجرون شامل ہیں:

بہت ساری تنظیمیں جن میں تنظیم الاخوان اور تنظیم اسلامی بھی شامل ہیں۔ یہ یقین رکھتی ہیں کہ ملک میں انتخابی عمل کے ذریعے شریعت کا نظام متعارف نہیں کروایا جا سکتا۔ اور وہ حکومت گرانے کے لیے متبادل کے طور پر طاقت کے استعمال کو بہترین طریقہ تصور کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ تنظیمیں فرقہ واریت اور عسکریت کی طرف جھکاؤ رکھتی ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ اپنے طریقہ کار میں جدیدیت کی حامل ہیں۔ وہ نظام میں مکمل تبدیلی چاہتی ہیں۔ ان کا طریقہ کار مذہبی سیاسی جماعتوں سے متضاد نظر آتا ہے۔ جنہوں نے موجودہ نظام کے ساتھ کام کرتے ہوئے بہ تدریج تبدیلی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی ہے۔

مذہبی جماعتوں کے منشور کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ ان کے متفقہ بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ ان کے بنیادی مقاصد میں معاشی، سیاسی، آئینی اور خارجہ پالیسی میں اصلاحات کے منصوبے بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کا مقصود ریاست اور معاشرے میں مکمل اسلام کا نفاذ ہے۔ ان میں سے بہت ساری جماعتیں اصلاحات تجویز تو کرتی ہیں۔ لیکن یہ واضح نہیں کر پائی ہیں کہ ان کو پالیسی میں کس طرح تبدیل کیا جائے۔ ان جماعتوں کی بہت ساری تجاویز میں حیران کن طور پر مماثلت پائی جاتی ہے اور اگر ان تنظیموں کے نام ان کی بنائی گئی دستاویزات پر نہ ظاہر ہوں تو ان کے منشورات کے درمیان فرق کرنا مشکل ہو جائے۔

مذہبی جماعتیں مختلف نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ جن میں مذہبی سماجیت کا فروغ بھی شامل ہے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ دیگر سیاسی جماعتیں کسی بھی قسم کی تبدیلی کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ جبکہ وہ صرف سیاسی اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں

اور نئے عالمی، سیاسی اور معاشی رجحانات سے بھی مطابقت اختیار کر لیتے ہیں۔ جبکہ دوسری جانب مذہبی جماعتیں اپنے آپ کو ایمان کی بنیاد پر ممتاز کرتی ہیں اور اپنے آپ کو پاکستان کے اسلامی نظریے کی محافظ گردانتی ہیں۔ وہ ملک کی سیاسی قیادت کو شکوک و شبہات سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ گمان کرتے ہیں کہ سیاسی قیادت ملک کو سیکولر ریاست بنانا چاہتی ہے۔

کسی ایک ایجنڈے پر متفق ہونا، یہ مذہبی جماعتوں کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنے مشترکہ مقصد کے لیے اکٹھے ہو کر جدوجہد کریں۔ یہ بات 1952 میں ہی واضح ہو گئی تھی۔ جب تمام مکاتب فکر پر مشتمل مذہبی سکالرز کے بورڈ نے متفقہ طور پر 22 نکات پر مشتمل اسلامی آئین کا ڈھانچہ مرتب کیا تھا۔ یہی ڈھانچہ پاکستان میں قائم تمام مذہبی جماعتوں کو بنیادی اصول فراہم کرتا ہے۔ اور ان کے منشورات انہی 22 نکات پر مشتمل ہیں۔

یہ جماعتیں خدائی قوانین کی حاکمیت پر زور دیتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ ریاست کو شریعہ کے متضاد کسی بھی قسم کی قانون سازی کا اختیار نہیں۔ بالآخر انہی 22 نکات میں سے چند نکات باقاعدہ طور پر 1973 کے قوانین کے آئین میں شامل کر دیئے گئے۔

ان مذہبی سیاسی جماعتوں کے درمیان دوسرا بڑا اتفاق 1976 میں دیکھنے میں آیا۔ جب سب نے متحد ہو کر ملک میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ اور بھٹو حکومت کو ہٹانے کے لیے اپوزیشن جماعتوں کے ساتھ مل کر ایک اتحاد کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کے نتیجے میں مارشل لاء لگا اور جنرل ضیاء الحق کے اسلامی نظام کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ تیسرا بڑا اتفاق 2000ء میں ہوا جب مذہبی سیاسی جماعتوں نے ایک انتخابی اتحاد متحدہ مجلس عمل (ایم ایم اے) تشکیل دیا۔ 2002 میں اس اتحاد نے قومی اسمبلی میں 65 نشستیں حاصل کیں۔ جبکہ صوبہ خیبر پختونخواہ (سابقہ سرحد) اور صوبہ بلوچستان میں اتحادیوں کے ساتھ مل کر حکومتیں بنائیں۔

مذہبی سیاسی جماعتوں کے نظریات کے درمیان اختلافات کبھی بھی ان کے مفادات کے لیے رکاوٹ نہیں بنا۔ جس کے نتیجے میں وہ ملک میں مذہبی سیاسی دائرہ کار کو بنانے اور اسے فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ تمام مذہبی جماعتیں صرف ایک مشترکہ مذہبی رجحان کا حصہ ہیں اور سیاسی سطح پر بھی مشترکہ مقاصد کی حامل ہیں۔ ان سب کا موقف معاشرے میں مکمل طور پر اسلامی نظام کا قیام اور مذہب کو فروغ دینا ہے۔

تاہم اس مسئلہ کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ابھی ہمیں مزید تحقیقات کی ضرورت ہے، خاص طور پر مختلف سیاسی، عسکری فرقہ وارانہ، اصلاحی اور تبلیغی، مذہبی جماعتوں کے اندرونی حرکیات کو جانچنے کی اشد ضرورت ہے۔ پھر ان کے مذہبی دائرہ کار اور نظریات کا ریاست اور معاشرے کے درمیان تعلق پر کتنا اثر پڑتا ہے۔ یہ ایک علیحدہ سے ایک سمت ہے جسے واضح کرنا ضروری ہے۔ اور یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ان کے بنیادی مقاصد کیسے ریاست کے اپنے مقاصد کے ساتھ متصادم ہیں، اور ان جماعتوں کے نظریات کی عوام میں سرائیت سے پاکستان میں ریاست اور معاشرے کے درمیان تعلق پر کیسے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

مصنف: محمد عامر رانا پاکستان انسٹیٹیوٹ آف پیس سٹڈیز کے ڈائرکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ سہ ماہی بنیادوں پر چھپنے والے تحقیقی روزنامچے 'کانفلکٹ اینڈ پیس سٹڈیز' کے ایڈیٹر بھی ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:

info@individualland.com

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

صحافت میں متبادل کی تلاش

از: سید عرفان اشرف

معذرت خواہانہ رویہ رکھنے والے میڈیا کے پیشہ ور افراد ہر سیمینار اور ورکشاپ میں باقاعدگی سے نظر آئیں گے۔ وہ ہمیشہ ملک میں صحافت کی ایک غم ناک تصویر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ سرکاری سطح پر حوصلہ شکنی اور کام کے لئے غیر محفوظ ماحول دو ایسے اہم عوامل ہیں، جنہیں وہ معلومات کے آزادانہ بہاؤ کی حوصلہ شکنی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ درحقیقت، فریب نظری کا شکار یہ سنکی قسم کے لوگ کسی اور چیز کی بجائے اندرونی کمزوری کے تابع ہوتے ہیں۔

زیادہ تر، معلومات کی آج کی دنیا میں اظہار رائے کا چلا چلا کر اظہار کرنا کوئی زیادہ بہتر ترجیح نہیں ہے۔ نئے میڈیا کے جادو نے عوام کو تقریباً ہر چیز آزادانہ طور پر اپ لوڈ اور ڈاؤن لوڈ کرنے کے لئے زیادہ مفید متبادل فراہم کر دیئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے محض کمپیوٹر استعمال کرنے کی صلاحیت اور کسی پیغام کو ایک مسئلے میں تبدیل کرتے ہوئے ایک ٹھوس آن لائن مہم چلانے کی مہارت موجود ہونے کی ضرورت ہے۔ عالمی سطح پر، اس حکمت عملی کی سوچ نے صحافت اور اس سے آگے حیران کن اثرات چھوڑے ہیں۔ علاوہ ازیں، اس عمل نے میڈیا کے پیشہ ور افراد کو رپورٹنگ کا دائرہ وسیع کرنے میں با اختیار بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ غیر پیشہ ور استعمال کنندگان نے بھی عرب دنیا کے بند معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔

ایک ایسے زمانے میں جب کہ دنیا بھر کے عام لوگ اپنی کھوئی ہوئی آواز واپس لا رہے ہیں، پاکستان میں صحافی ابھی تک الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں؟ دستیاب متبادل کو طریقے سے استعمال کرنے کی بجائے، ان میں سے زیادہ تر دو انتہائی پوزیشنوں کے درمیان فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں۔ کچھ کو سچائی کے ساتھ جان بوجھ کر سمجھوتہ کرتے ہوئے پایا جا سکتا ہے، جب کے دوسرے اس سچ کو بہت بھونڈے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی صحافی ایک ردعمل کے لئے کسی کو مشتعل کرتا ہے، تو باقی ماندہ اس حرکت کو سچ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا بہانہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا انداز ہے جو پاکستان میں کام کرنے کے لئے اپنایا جا رہا ہے: دوسروں پر قابو پانے کے لئے چند ایک کو دھمکا کر رکھو۔

کچھ عرصہ قبل اسلام آباد میں جھگڑوں کی صورت احوال میں میڈیا کے کردار پر ایک بحث کا اہتمام کیا گیا تھا۔ کچھ صحافیوں نے یہ شکایت کی تھی کہ انہیں اسلام آباد کے بیچوں بیچ عوامی سڑکوں پر تجاوزات رپورٹ کرنے میں مشکل کا سامنا ہے۔ تاہم، جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے اس مسئلے پر بہتر اور محفوظ طریقے سے قابو پانے کے لئے کچھ کیا، تو وہ کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ ہر روز انتہائی اہمیت کی عوامی خبریں نیوز روم میں صرف اس لئے ضائع ہو جاتی ہیں کہ عام طور پر کوئی نہ کوئی زیادہ طاقت ور ان میں ملوث ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اگر کوئی طاقت ور فریق ملوث ہو تو اس خبر کو مشکل ہی سے خبر تصور کیا جاتا ہے۔

عموماً اس وقت تک معاملات بہت موزوں انداز میں کام کرتے ہیں جب تک ان میں سوچ بچار کرنے والے پیشہ ور لوگ شامل رہتے ہیں۔ 2009 میں سوات میں جنگجوؤں کی شکست کے بعد تحویل میں لئے گئے افراد کے قتل کے انتہائی خوف ناک مرحلے کا آغاز ہو گیا تھا۔ مسئلے کی صورت حال کی سنگینی اور حساسیت نے پشاور کے صحافیوں کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ آنکھوں دیکھے واقعات پر اپنا فیصلہ صادر کرنے سے گریز کریں۔ اس کے بجائے، چند مقامی صحافیوں نے کمیشن برائے انسانی حقوق کے لئے ذمہ داری نبھاتے ہوئے دوسروں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی۔ اس مسئلے پر کمیشن برائے انسانی حقوق پاکستان کی جانب سے کی جانے والی پریس کانفرنس کے بعد، صحافیوں نے اس عمل کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ لہٰذا اگلے ایک ماہ کے لئے تحویل میں قتل کے واقعات پر میڈیا میں لرزہ خیز سرخیاں نظر آنے لگی تھیں، جس کی وجہ سے عوامی جگہوں پر مشتعل ہجوم کی کارروائیوں میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔

چیلنج کی صورت احوال میں، صحافت اچھی طرح تیار نہ کئے گئے افراد کی کھیپ کے لئے ایک پیشہ تصور نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ صورت احوال میں، موثر صحافت کے لئے کہ میڈیا کے پیشہ ور افراد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایک عام روش سے ہٹ کر

استعداد تشکیل دینے کے بارے میں سوچیں۔ لیکن، بدقسمتی سے، پاکستان میں اب یہ کام مزید نہیں کیا جارہا۔ صحافی مزاحمت کرنے کو ترجیح نہیں دیتے اور نہ ہی وہ عوامی اہمیت کے مسائل کے بارے میں با مقصد رپورٹنگ کا فرض پورا کرنے کے لئے متبادل استعمال کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟

روائتی طور پر، پاکستان میں صحافی لکھتے زیادہ اور پڑھتے کم ہیں۔ اکثر اوقات وہ خود اپنی لکھی ہوئی تحریریں پڑھنا گوارا نہیں کرتے۔ اس قسم کا ماحول عموماً کام کرنے والے پیشہ وارانہ معذوروں کی کھیپ پیدا کرتا ہے۔ ان کے لئے آزادانہ رپورٹنگ مشکل ہے کیوں کہ وہ اپنے سامنے موجود صورت حال کا واضح تصور تشکیل دینے میں اکثر مشکل محسوس کرتے ہیں۔ ان کی یہ کمزوری معلومات کے ذریعے پر ان کے انحصار میں اضافہ کر دیتی ہے اور انہیں مطلوبہ ماحول میں پیشہ ورانہ طور پر گھلنے ملنے کی استعداد سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ تضاد معذرت خواہانہ رویہ رکھنے والے صحافیوں کے کچھ حلقوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ جب وہ اپنے آپ کو پیشہ ورانہ فرائض کی انجام دہی میں معذور محسوس کرتے ہیں تو اس شعبے میں اپنی بقاء کا جواز پیدا کرنے کے لئے مختلف قسم کے حیلے بہانے بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

مزید جو بات صحافیوں کے لئے اچھی اور صحافت کے لئے زیادہ بہتر نہیں ہے، وہ دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں پاکستان کی جانب سے ایک اہم اتحادی ملک کا کردار ادا کرنے کے بعد کام کرنے کے انداز میں ناقابل یقین حد تک تبدیلی کا پیدا ہونا ہے۔ پاکستان میں جنگجو رجحانات میں اضافے کے ساتھ ساتھ ہی الیکٹرانک میڈیا کی کشادگی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ نوخیز سروس کی صنعت میں کثیر رقم ڈالنے کے بعد مصنوعی فراوانی نے مقامی مارکیٹ کو نقصان پہنچایا ہے۔ ورکنگ صحافی 2000 میں 2,500 سے 2011 میں 17,000 تک پہنچ گئے ہیں جس نے ان کی اوسط عمر 2000 میں 47 سال سے کم کر کے 2011 میں 24 سال کر دی ہے۔ لیکن اس کا ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ پاکستان کے بارے میں غیر ملکی این جی اوز کی بڑھتی ہوئی توجہ کے ساتھ پشاور، اسلام آباد اور لاہور کے شہری مراکز کے باذرائع صحافیوں کا انحصار اب صرف صحافت پر نہیں رہا۔ اپنے اخبارات کے علاوہ، ایسے اداروں کے ساتھ ان کی وابستگی نے ان کی پیشہ ورانہ خصوصیات پر ایک سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس نے ایک ہی وقت میں مختلف کام انجام دینے والی صحافتی کمیونٹی کو معیاری پیشہ وروں سے محروم کر دیا ہے، جو صحافت کے پلیٹ فارم کو ایک اختتامی ذریعے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں اور نہ کہ خود اس کے اختتام کے طور پر۔

تمام باتوں میں ایک سنگین بات امیر اور غریب صحافیوں کے درمیان بڑھتا ہوا عدم توازن ہے۔ حالانکہ تعلیم یافتہ اور شہری میڈیا کے پیشہ ور صحافی ایک سے زائد ذرائع سے کما رہے ہیں، لیکن ان میں سے باقی ماندہ صحافیوں کی ایک بڑی تعداد اتنی خوش قسمت نہیں ہے۔ وہ خود اپنے کام میں سخت انداز اپنانے کی وجہ سے اس محرومی کا شکار ہیں۔ ان کی اکثریت کو ان کے قابلیت کی نسبت کم معاوضہ ملتا ہے؛ کچھ کو تو معاوضہ ملتا ہی نہیں، جب کہ باقی ماندہ کو معاوضہ وقت پر نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں، میڈیا مالکان کم قابلیت رکھنے والے اپنے کارکنوں کی استعداد میں اضافہ کرنے کے لئے کسی قسم کی سرمایہ کاری نہیں کرتے۔ اس صورت حال نے صحافتی کمیونٹی کو تذبذب کا شکار کر دیا ہے۔ ان پر دباؤ تو بڑھتا جارہا ہے لیکن اس دباؤ کو وہ پیشہ ورانہ انداز میں ختم کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔

اس افسوس ناک صورت حال کے پیش نظر، بنیادی ذمہ داری صحافتی تنظیموں پر عائد ہوتی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹیوں میں اپنے ارکان کے لئے پلاٹوں کی الاٹمنٹ یقینی بنانے کی بجائے، ایسی تنظیموں کو ان کی استعداد بڑھانے پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تربیت انہیں ایسے جنگی حالات میں اپنا کردار ادا کرنے کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں مدد دے سکے گی جن میں وہ بغیر کسی تیاری کے پھنس گئے ہوں۔ بہر حال صحافی نہ تو ایک کوریئر ہے اور نہ ہی ایک اسٹینوگرافر۔ ان کی بنیادی ذمہ داری با مقصد رپورٹنگ کے گرد گھومتی ہے۔ معذرت خواہانہ رویہ اپنانے سے وہ ایسی صورت حال میں کوئی مثبت مقصد حاصل نہیں کر سکتے جو طاقت ور استحصالی قوتوں کے سامنے عوامی دلچسپیوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے جارحانہ اور آزادانہ کردار کی متقاضی ہے۔

مصنف: سید عرفان اشرف یونیورسٹی آف پشاور کے جرنلزم ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرر کی حیثیت سے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ ڈان اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ ان کا صحافت سے دیرینہ تعلق ہے اور فاٹا کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

سوات کو انتہا پسند بنانے میں مواصلات کا کردار

از: خالد عزیز

امریکی دفاعی بورڈ 2004 سمر اسٹیڈی، "Transition To & From Hostilities" (دشمنیوں کی جانب اور ان کی جانب سے منتقلی) نے یہ نتیجہ دیا ہے کہ مسلح جھگڑوں سے متاثرہ ممالک میں جنگی اہمیت کے حامل مواصلات فوجی آپریشنز سے زائد نہیں تو ان کے برابر اہمیت رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں جنگی مواصلات پر ڈالروں میں خرچ کی جانے والی کوئی بھی رقم بغاوت پر قابو پانے، بحالی اور تعمیر نو کے دیگر عوامل پر آنے والے اخراجات سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں گزشتہ دس برسوں کے دوران ہمارے تجربات کی روشنی میں حاصل ہونے والے بہت سے اسباق کی دستیابی کے باوجود مخصوص ذہنوں کی تبدیلی کے اس پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دی جاسکی۔

معرض وجود میں آنے کے بعد سے اب تک پاکستان نے ایک حفاظتی سلطنت کا کردار ادا کیا ہے جہاں صاحب حیثیت افراد نے ٹیکس کی کم ادائیگی کے فوائد حاصل کئے وہاں فائدہ پہنچانے والوں کی بچت منتقل ہوجانے کے نتیجے میں اس سے زائد رقم خرچ ہوگئی - فائدہ پہنچانے والوں میں امریکہ، سعودی عرب، اور برطانیہ سرفہرست ہیں۔ جب کہ ہم نے وسائل حاصل کئے جن کی وجہ سے صاحب حیثیت افراد کو اچھا وقت گزارنے اور عوام پر حکومت کرنے کا موقع ملا، پھر بھی دفاعی معاہدوں اور 1980 کی دہائی میں افغانستان کی طرح دوسروں کی جنگیں لڑتے ہوئے، ہم نے بنیادی نظریات درآمد کئے جنہیں پاکستان کی قانونی Grundnorm کا حصہ بننے کی حوصلہ افزائی کی جس کے نتیجے میں جہادی تنظیموں کی افزائش کی حوصلہ افزائی ہوئی۔

افغانستان میں روس کے خلاف جہاد میں جنگ کے لئے مسلمانوں کی بھرتی کی حوصلہ افزائی کے لئے، سعودی عرب سے حاصل کئے جانے والے بہت سے فتووں کے پرچار کے نتیجے میں جنگ کی نج کاری کے بعد، تشدد پر اکسانے والے یہ نظریات پاکستان میں خود بخود چھا گئے جس کے نتیجے میں جہادی پارٹیوں کے زیر انتظام ایک متوازی انتظامی نظام عمل میں آگیا جس کے تحت وزیرستان، باجوڑ اور سوات میں دہشت گردی کے تربیتی کیمپ قائم کرتے ہوئے ستمبر 2001 کے بعد حکومت پاکستان کے اختیارات کو چیلنج کردیا گیا۔

مئی 2009 میں افواج پاکستان کو سوات میں ہونے والی بغاوت کو کچلنے کے لئے طلب کیا گیا جہاں سے پانچ لاکھ سے زائد افراد سوات کے طالبان کے خوف کی وجہ سے اس لئے بے گھر ہوگئے تھے کہ طالبان نے بہت سارے شہریوں اور سیکورٹی کے عملے کے ساتھ ساتھ 17 سے زائد خواتین کے سر قلم کردیئے تھے۔

2010 میں ریسرچ کے ایک ادارے ریجنل انسٹی ٹیوٹ برائے پالیسی ریسرچ وٹریننگ پشاور کی جانب سے سوات کے 384 گھرانوں کے سروے سے معلوم ہوا کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف خیالات رکھتے ہیں۔ ان شعبوں میں سے ایک جس پر اسٹیڈی کی گئی وہ سوات کو انتہا پسند بنانے میں مواصلات کا کردار تھا۔ مواصلات کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ خیالات، آراء کے اظہار یا ان کا تبادلہ، یا مختلف الیکٹرانک ٹیکنالوجی استعمال کئے بغیر تقریر، تحریر یا دستخط کے ذریعے معلومات کی فراہمی کا ذریعہ ہے۔ سروے سے پتہ چلا کہ سوات کے طالبان ''ملا ریڈیو'' کے ذریعے ایف ایم ریڈیو نشریات پر مواصلاتی انحصار کرتے تھے۔

مواصلات سے متعلق سروے سے حاصل ہونے والے اہم نتائج ذیل میں درج کئے جارہے ہیں جو قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوسکتے ہیں۔ 78 فی صد جواب دہندہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ طالبان کی حمایت میں وسعت کے حصول میں ایف ایم نشریات بہت زیادہ موثر تھیں۔ 67 فی صد گھرانوں کا خیال تھا کہ افغان مولویوں کی جانب سے مساجد میں دیئے گئے تبلیغی خطبات نے طالبان کے لئے حمایت ہموار کی تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات محسوس کی گئی کہ وہ افغان جو 1980 کی دہائی میں مہاجرین کی حیثیت سے پاکستان آئے تھے وہ کیمپوں ہی میں پرورش پاتے رہے اور وہیں رہائش پذیر رہے۔ جب وہ بڑے ہوئے تو انہیں کوئی ملازمت نہیں ملی۔ لہٰذا ان کے لئے سب سے اچھی ملازمت یہ تھی کہ وہ خیبر پختون خواہ اور فاٹا کی مساجد میں مولوی بن جائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سوات کی زیادہ تر مساجد پر افغان ملا ہی قابض ہیں جو ان ہی مدرسوں میں زیر تعلیم رہے جہاں خیبر پختون خواہ کی اسمبلی کے بہت سے ارکان پڑھتے رہے ہیں؛ بہت سے وجوہات میں سے اس ایک وجہ کے طور پر 2007-2002 میں ایم ایم اے کی اتحادی حکومت سوات کے حالات پر قابو نہیں پاسکی۔ ایک اور سروے میں 70 فی صد گھرانوں نے بتایا کہ افغان طالبان نے اسلحہ اور افرادی قوت کی فراہمی کے ذریعے سوات کے جنگجوؤں کی مدد کی۔

75 فی صد گھرانوں کا خیال تھا کہ جنگجوؤں کے حمایت کے لئے سوات کے عام لوگوں کو متحرک کرنے کے لئے جمعہ کے خطبات کا استعمال کیا گیا۔ 67 فی صد گھرانے یہ سمجھتے تھے کہ مساجد میں افغان مولویوں کے مذہبی اثر ورسوخ کی وجہ سے ان کے منہ سے

نکلے ہوئے مواصلاتی الفاظ افغانستان میں امریکی مداخلت کے خلاف جہاد کے لئے حمایت کا سبب بنتے تھے۔

تاہم، اس مواصلاتی نظام کا سب سے زیادہ تباہ کن اثر عورتوں پر پڑتا تھا۔ جیسے ہی طالبان نے سوات کا کنٹرول سنبھالا انہوں نے عورتوں کیکھلی جگہوں پر موجودگی پر پابندی لگادی؛ اس طرح عورتیں گھروں تک محدود ہوکر رہ گئیں۔ دوسرے طالبان نے دوڑ میں موجود دیگر ذرائع ابلاغ، جیسا کہ ٹی وی اور عام ریڈیو، کو غیر اسلامی قرار دیتے ہوئے ان پر پابندی عائد کردی؛ ٹی وی پر تصاویر دکھانے کی وجہ سے اور ریڈیو پر گانے نشر کرنے کی وجہ سے۔ اس طرح عورتیں اپنے گھروں میں قید ہوکر رہ گئیں اور ان کی تفریح محض ریڈیو سننے تک رہ گئی اور ریڈیو میں بھی صرف ''ریڈیو ملا'' ہی دستیاب تھا۔ بہت سے خواتین، جنہوں نے سروے کے دوران فوکس گروپ کے تبادلہ خیال میں حصہ لیا، نے بتایا کہ ریڈیو ان کی طاقت کی حیران کن شکل کا بھی ایک ذریعہ تھا۔ وہ سوات طالبان کے قائد ملا فضل اللہ سے ٹیلی فون پر مسائل کے بارے میں سوالات کرسکتی تھیں۔ وہ اپنے ناراض مردوں کے خلاف شکایات بھی درج کرواسکتی تھیں اور بہت سے مردوں نے وارننگ ملنے کے بعد اپنے آپ کو خواتین کی خواہشات کے سامنے سرِتسلیم خم کیا تھا۔

اس کے بدلے میں فضل اللہ نے اس بات کی ترغیب دی تھی کہ اگر وہ اپنے زیورات اور جمع پونجی ان کے مقصد کے لئے عطیہ کردیں تو یہ اسلام کی خدمت ہوگی۔ اس انداز میں طالبان تحریک نے مالی وسائل پیدا کئے۔ سوات کے گھروں میں فوکل پوائنٹ تشکیل دیئے گئے جن کے ذریعے ان کے شوہروں اور بیٹوں سمیت مردوں کو طالبان کا ساتھ دینے پر تیار کیا گیا۔ دوسرے، کیوں کہ سوات میں عورتوں کو اچھی تعلیم حاصل نہیں ہے اس لئے وہ ''ریڈیو ملا'' سے نشر کی گئی ہر بات کو تسلیم کرلیتی تھیں۔

ایک لحاظ سے سوات کی عورتیں طالبان کی غلام بن کر رہ گئی تھیں اور انہیں مالی اور افرادی قوت فراہم کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ فوجی آپریشن میں سوات سے طالبان کے تشدد پسند نیٹ ورک کے خاتمے کے بعد بھی کچھ عورتیں اس بات کی خواہش کرتی ہیں کہ پرانے اچھے دنوں کا ''ریڈیو ملا'' واپس آجائے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ اگر حکمرانی کو بہتر بنانا اور حکومت کا اختیار مستقل طور پر برقرار رکھنا ہو تو حکومت کو ہر طرح کی مواصلاتی اشکال میں بہت بھاری سرمایہ کاری کرنا ہوگی۔ حکمت عملی پر مبنی مواصلات کے ماہرین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوات میں اسکول، اسپتال یا نئی سڑکیں بنانے کی نسبت اچھے مواد پر مبنی ایف ایم ریڈیو نشریات ایک بہتر ترجیح ہوگی۔

مصنف: جناب خالد عزیز تیس سال سے زائد عرصہ سول سروس میں مختلف حیثیتوں میں فرائض انجام دے چکے ہیں۔ سول سروس کے بعد 2003 میں انہوں نے اپنی کنسلٹنسی فرم کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ وہ خیبر پختونخواہ پر گہری نظر بھی رکھتے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:

info@individualland.com

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

لبرل نکتہ نظر

انڈویجوئل لینڈ انفرادیت اور آزادانہ رائے پر گہرائی سے یقین رکھتا ہے۔ یہ ادارہ ایک پختہ لبرل نکتہ نظر کا حامی ہے۔ اس ادارے میں کام کرنے والے ساتھیوں نے پانچ مختلف مضامین کے ذریعے اس نکتہ نظر کا اظہار کیا ہے، جن کے عنوان کچھ یوں ہیں: بے ربط نوجوان، تبلیغ فریب، سماجی میڈیا میں دہشتگرد، تنازعات کے خواتین پر اثرات اور حقیقت کیا ہے؟

ان تحریروں کے ذریعے ہم نے اس حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ میڈیا کس طرح سے معلومات کو پھیلاتا ہے اور عوام پر ان معلومات کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لبرل نکتہ نظر ہمیں یہ یقین دہانی کراتا ہے کہ میڈیا محض ایک سروس نہیں بلکہ ایک صنعت بھی ہے؛ ایک ایسا آلہ جو اپنے پڑھنے اور دیکھنے والے کو طاقت فراہم کرتا ہے۔ مگر یہ طاقت بغیر ذمہ داری کے بے معنی ہے۔

ہم جب بھی ذمہ دار میڈیا کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ ہرگز بھولنا نہیں چاہیے کہ عوام یا معلومات کے صارفین ہی میڈیا کو ذمہ دار اور جوابدہ بنا سکتے ہیں۔ ایک صارف ہی لوگوں پر میڈیا کے تسلط کو قابو میں لا سکتا ہے۔ ایک صارف کا ذمہ دارانہ رویہ اسے اپنے نکتہ نظر کے برملا اظہار کا موقع فراہم کرتا ہے اور اسی طرح وہ میڈیا کو بھی اس رخ پر مائل کر سکتا ہے جس رخ میں وہ خود چلنا چاہتا ہے۔

معلومات کے صارفین ہونے کے ناتے ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ حکومت کی بلاوجہ مداخلت عوام سے اس طاقت کو چھین لیتی ہے اور اسے حکومت کے حوالے کر دیتی ہے۔ یہ اس لئے بھی غلط ہے کہ اس عمل سے حکومت کی طاقت، حاکمیت اور اجارہ داری میں بلاوجہ اضافہ ہوتا ہے۔

اسی لئے ہمیں سبک گفتار، ذمہ دار اور منظّم صارفین بننے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اس طاقت کی ضرورت ہے تو ذمہ داری کو یقینی بنانا ہوگا۔ ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلانا ہوگا اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا کھلم کھلا اظہار کرنا ہوگا۔ اگر تو معلوماتی بلیک ہول موجود ہیں تو ہمیں صارفین کی حیثیت سے اس گم شدہ معلومات کا مطالبہ کرنا ہوگا۔

سب سے آخر میں یہ کہ میڈیا کی آمدنی بھی ہم صارفین کی تعداد پر ہی منحصر ہوتی ہے۔ کیوں نا اس دفعہ ہم ایک لبرل آواز کی حیثیت سے گنے جائیں۔ ایک ایسی آواز جو کسی قسم کی ہٹ دھرمی، دباؤ اور تعصب سے پاک ہو۔

حقیقت کیا ہے؟

از: ذوالفقار حیدر

اسلام آباد کے سیکٹر جی سکس کے رہائشی آج بھی مشین گنوں کی ہولناک آوازوں اور بمباری کو یاد کرتے ہیں جس نے آنے والے سالوں میں پورے ملک کے حالات کو ایک سمت فراہم کی۔ حقیقت کیا تھی؟ یہ آج بھی کوئی نہیں جانتا۔ سب وہی جانتے ہیں جو انہیں میڈیا نے بتایا اور دکھایا۔ میں بھی اسی عوام کا حصہ ہوں جو اس واقعے کی حقیقت سے کسی حد تک ناواقف ہے۔ ہاں البتہ زیادہ تر عوام میڈیا سے کافی حد تک اتفاق ضرور کرتی ہے، جبکہ میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں۔ یہ واقعہ اس وقت کی حکومت کی جڑوں میں بیٹھ گیا اور اسے اقتدار چھوڑنا پڑا۔

البتہ اسلام آباد کا رہائشی ہونے اور خاص طور پر جی سکس کے ساتھ گہرا تعلق ہونے کے ناتے میں چند ایسے حقائق سے واقفیت رکھتا ہوں جو شاید ان ابہامات کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوں جو زیادہ تر لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔ لال مسجد اسلام آباد کی سب سے پہلی مساجد میں سے ایک ہے۔ میں تقریباً دس سال اس سیکٹر سے وابستہ رہا ہوں۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، ہر جمعے کو اس مسجد کے لاؤڈ سپیکر ایک خاص فرقے کے خلاف زہر اگلتے سنائی دیتے تھے اور یہ صورت حال ہر جمعے کو سامنے آتی تھی۔ میرے بہت سے عزیز دوست جو آج بھی اس سیکٹر میں رہائش پزیر ہیں، ان خطبات کے زیر اثر وہی بولی بولنا شروع ہو گئے۔ یقیناً یہ میرے لئے ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ خیر وقت گزرتا رہا اور ہم سب اپنی زندگیوں میں مصروف ہو گئے۔ پھر نا جانے کب اس مسجد سے ملحقہ ایک چلڈرن لائبریری پر قبضہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے 'لال مسجد' کا واقعہ رونما ہوا۔

یہ سارا واقعہ بیان کرنے سے میری مراد یہ تھی کہ میڈیا جس پر ہماری ساری عوام اندھا اعتماد کرتی ہے، اس کی بیان کردہ حقیقت شاید درست نہیں تھی۔ مگر یہ سب میرا خیال ہے اور اس سے میں کسی کی بھی دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔ یقیناً اس واقعے میں بہت سے لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے، مگر جوابی فائرنگ اور کم از کم دس شہید ہونے والے آرمی اور سکیورٹی فورسس کے اہلکار کچھ اور کہانی سناتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور جتنی تعداد میں اس مسجد سے اسلحہ برآمد ہوا، وہ بھی میڈیا کی بتائی ہوئی حقیقت سے متضاد ہے۔ میڈیا سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سکیورٹی فورسس نے ایک ہی تابوت میں ایک سے زیادہ لاشوں کو دفنایا اور مرنے والوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار سے کہیں زیادہ تھی۔

مگر اس واقعے کے بعد دہشتگردی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا، جو آج تک ہمارے لئے وبال جان بنا ہوا ہے۔ میڈیا نے جو کہا اور دکھایا اس نے بہت سے لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کیا اور وہ آج بھی یہی تصور کرتے ہیں کہ یہ واقعہ ایک زیادتی تھی۔ مگر جو پس منظر میں نے شروع میں بیان کیا اور جو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سنا، کم از کم میں اس حقیقت سے اتفاق نہیں کر سکتا۔

لاٹھی بردار طلباء لال مسجد کے باہر کھڑی پولیس موبائل کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔
حوالہ: 3quarksdaily.blogs.com

میڈیا ایک ذمہ دار رویے کا نام بھی ہے، کیونکہ لوگ اس پر اندھا اعتماد کرتے ہیں۔ لہٰذا، اسے ایک نتیجے پر پہنچنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ اس کے لوگوں پر کیا اثرات ہو سکتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ میڈیا ایک ایسے وقت میں آزاد ہوا کہ جب ملک آمریت کے زیر اثر تھا اور اس سے پہلے کی جمہوری حکومتیں میڈیا کو مختلف انداز میں خاموش کرواتی رہیں۔ ضیاء دور حکومت میں جہاں طالبان، اسلحہ اور منشیات میں اضافہ ہوا، وہیں انتہا پسندی بھی ہمارے معاشرے میں گھر بنانے میں کامیاب ہوئی۔ یہ انتہا پسندی کسی ایک طبقے تک محدود نہیں رہی، بلکہ ہمارے تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں بھی گھر کر گئی۔ میڈیا سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر افراد اس دور میں یقیناً انہیں تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم تھے اور جب وہ وہاں سے فارغ ہو کر پیشہ ورانہ زندگیوں میں داخل ہوئے تو انہوں نے اسی طرز خیال کو فروغ دیا جو شاید ان کے ذہنوں میں جگہ بنا چکا تھا۔

یہ سب جانتے بوجھتے ہوا یا نہیں، اس حقیقت سے تو وہی لوگ واقف ہیں جو اب لوگوں کی آراء کو تبدیل کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ مگر آج بہت سے ایسے

اخبارات اور ٹی وی چینلز کام کر رہے ہیں جو کسی نا کسی طریقے سے انتہا پسندی کو فروغ دیتے ہیں۔ یہ میں نہیں کہتا بلکہ وہ تحریریں کہتی ہیں جو طالبان اور ان کی طرح کی بہت سی دوسری مسلح جماعتوں سے ہمدردی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ افغان طالبان، پاکستانی طالبان کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ شاید آج بھی وہ اسی دور میں رہتے ہیں کہ جب پاکستان افغان طالبان کو مدد فراہم کرتا تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ دہشتگردوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا اور وہ صرف اور صرف طاقت کے حصول کے لئے کوشاں ہوتے ہیں اور طالبان خواہ افغان ہوں یا پاکستانی، دونوں اپنے ملکوں کی فوج کے خلاف لڑ رہے ہیں جو کہ اسلام کی تعلیمات کے بھی خلاف ہے۔

میرے جیسے بہت سے نوجوان آج اضطراب کا شکار ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کس کی بات پر یقین کریں۔ میرا ماننا تو یہ ہے کہ پاکستان کی سلامتی دوسری تمام حقیقتوں سے بالاتر ہے۔ دہشتگردوں کا کام ملکی سلامتی کو ٹھیس پہنچانا ہے اور جو لال مسجد میں ہوا، وہ بھی دہشتگردی تھی۔ اور جن طلباء اور طالبات نے دہشتگردی کا سہارا لینے وہ بھی اتنے ہی قصوروار تھے کہ جتنا ان کو سبق پڑھانے والے تھے۔ اگر آج بھی ہم اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے تو شاید ایک دو بنگلہ دیش اور وجود میں آجائیں گے۔ ہمارے ملک کا نوجوان طبقہ آنے والے وقت میں اس ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالے گا، اسی لئے ان کے ذہنوں کو ان ابہامات سے پاک کرنا ضروری ہے۔ جیسا کہ دین کی سلامتی مسلمانوں کے لئے ضروری ہے، اسی طرح ملک کا وجود اور سلامتی بھی اہم ہے۔ میڈیا معاشرے کی آواز بنتا ہے، مگر اسے معاشرے کی آراء کو بدلنے کی بجائے حقیقت سے آگاہ کرنا چاہیے اور اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے ردعمل کو فروغ دینا چاہیے۔ عوام کی آراء کو اپنے مشوروں سے تبدیل کرنا درست نہیں۔ میڈیا کو اصلاحات کی ضرورت ہے تاکہ انتہا پسندی کو ہم اپنے معاشرے میں مزید پیوست ہونے سے روک سکیں۔ میڈیا کو آج کے نوجوانوں کے مسائل پر غور کرنا چاہیے تاکہ جب آنے والے وقت میں یہ نوجوان میڈیا اور دوسرے اداروں کا حصہ بنیں تو انہیں ان کی سچائی پر شک نا ہو۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com
انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

لاٹھی بردار طالبات لال مسجد سے متعلقہ ہاسٹل کے باہر کھڑی ہیں۔
حوالہ: 3quarksdaily.blogs.com

تبلیغِ فریب

از: یحییٰ احمد

17مارچ2011ء کوایک سرکردہ پاکستانی اخبار میں ایک چیختی چلاتی شہ سرخی ''بیچ دیا گیا'' شائع ہوئی۔ یہ خبر لاہور میں کی جانے والی فائرنگ کے ملزم ریمنڈ ایلن ڈیوس کی رہائی کے سلسلے میں تھی۔ ذرائع ابلاغ میں ملزم کو غیر معمولی طور پر تشہیر دی گئی تھی اور اس واقعہ کو قومی سالمیت کے مسئلے سے تعبیر کیا جارہا تھا۔ اس واقعہ کو سیاق وسباق سے ہٹ کر پیش کرنے کا سارا کریڈٹ ذرائع ابلاغ کے ایک مخصوص طبقے کو جاتا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے اس مخصوص طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد نے اس واقعہ کو اس تمام عرصے کے دوران عوام کے سامنے ایک مخصوص زاویے سے پیش کر کے اس مسئلے کو خوب اچھالا۔ مختلف ٹیلی ویژن چینل سے پیش کیے جانے والے ٹاک شوز میں اینکر پرسنز اور میزبانوں نے عدالت کی طرف سے کسی بھی چیز کا تعین کیے جانے سے پہلے ہی ملزم کا میڈیا ٹرائل کر ڈالا اور اپنے ناظرین کے سامنے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ صرف چند ہی معقول آوازیں سنائی دیں اور ان کے خیالات کو اس سارے تماشے میں شاذ ہی پذیرائی ملی۔ اس مسئلے کا ڈراپ سین ظاہر ہو جانے کے باوجود کہ شروع سے ہی یہ طے تھا کہ آخر کار ملزم کو رہا کر دیا جائے گا، شہریوں کے جذبات کو مشتعل کیا گیا اور اس واقعے کو امریکہ کے خلاف پراپیگنڈے کے بہانے کیلئے سیڑھی کے طور پر استعمال کیا گیا اور دہشت گردی کے خلاف جنگ سے متعلق سوالات اٹھائے گئے۔ اس پورے مہینے کے دوران ہر پاکستانی نے اس ایک فرد کو پاکستان میں تمام برائیوں کی جڑ قرار دیا۔ مالکم X (Malcom-X) نے شائد ٹھیک ہی کہا ہے: ''۔۔۔ان (ذرائع ابلاغ) میں کسی بے گناہ کو مجرم بنا دینے اور کسی مجرم کو بے گناہ بنا دینے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے اور یہی وہ صلاحیت ہے۔۔۔''

پاکستان میں ذرائع ابلاغ کو نئی نئی آزادی ملی ہے اور عوام کو اس بات کا یقین ہے کہ ذرائع ابلاغ اس آزادی کا ذمہ داری کے ساتھ استعمال کریں گے۔ عوام ممکنہ طور پر کم وبیش ہر اس لفظ پر جو ذرائع ابلاغ سے نشر ہوتا ہے یا ان میں شائع ہوتا ہے، یقین کر لیتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے پیش کیے جانے والے مواد سے ہی عوام کی رائے تشکیل پاتی ہے۔ جنگ سے متاثرہ علاقوں میں ذرائع ابلاغ کی موجودگی سے وہاں کی صورتحال کی تصویر سامنے لانے میں مدد ملتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ذرائع ابلاغ نے سرکاری مشینری میں شفافیت کو یقینی بنایا ہے اور اپنے آپ کو بطور اہم ادارہ پیش کیا ہے جو مملکت اور اس کے شہریوں کی خدمت کر رہا ہے۔ پاکستان میں بھی ذرائع ابلاغ اسی منزل کی جانب گامزن ہیں لیکن اس وقت ایک مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جب ذرائع ابلاغ کا ایک مخصوص طبقہ کسی خبر کے بارے میں جانبدارانہ موقف پیش کر کے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خبروں میں تبصروں کو بڑی آسانی کے ساتھ گڈمڈ کر دیا جاتا ہے اور یوں عوام میں غلط رائے تشکیل دی جاتی ہے مثلاً لاہور میں فائرنگ کے واقعے کی رپورٹنگ کرتے ہوئے ایک سرکردہ اخبار نے اگلے ہی دن یہ سرخی جمائی ''امریکی ریمبو شہر میں تشدد پر اتر آیا'' معلوم ہوتا تھا کہ زور واقعہ کی کوریج پر نہیں بلکہ جذبات مشتعل کرنے پر ہے۔ اسی طرح ٹی وی چینلز سے نشر ہونے والے ٹاک شوز اور نیوز سٹوریز سے دائیں بازو کے ایجنڈے کی طرف جھکاؤ کا واضح اظہار ہوتا تھا۔ یہ بات اس وقت بھی سامنے آئی تھی جب سلمان تاثیر کے قتل کے بعد پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے انہیں بطور شہید پیش کرنے سے اعتراز کیا۔ عوام جو ذرائع ابلاغ کے قواعد وضوابط سے زیادہ تر بے بہرہ ہوتے ہیں اس بات میں فرق کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ کیا چیز خبر ہے اور کیا چیز خبر نہیں ہے۔

ریمنڈ ڈیوس اپنے حصے کی کوریج اور مقدمے کا سامنہ کر رہا ہے۔ ماخذ: ایکسپرس ٹریبیون

ذرائع ابلاغ کے اس مخصوص طبقے کو عسکریت پسند میڈیا یا جہادی میڈیا قرار دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ذرائع ابلاغ کا ظہور قیام پاکستان کے ساتھ ہی ہو گیا تھا جب ملک کو واحد مسلمان مملکت کے طور پر پیش کیا گیا۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی پارٹیاں اور ان کے سرپرست مختلف اداروں میں گھس گئے اور میڈیا ان اداروں میں سے ایک تھا۔ 1940ء کی قرارداد پاکستان میں درج اقلیتوں کے حقوق اور اسمبلی سے محمد علی جناح کے پہلے خطاب میں ریاستی امور کو مذہب سے الگ کرنے کی بات کو بڑی آسانی کے ساتھ طاق نسیاں میں رکھ دیا گیا۔ 1980ء کی دہائی میں ضیاء کے دور میں قدامت پسند ذرائع ابلاغ کو پھلنے پھولنے کا خوب موقع ملا۔ میڈیا کے یہ مخصوص طبقات اسی دور میں عسکریت پسند یا جہادی میڈیا میں ڈھل گئے۔ افغان جنگ کے دوران تعلقات عامہ

کیلئے ذرائع ابلاغ کو بروئے کار لا کر انہوں نے اپنا اثر ونفوذ بڑھا لیا۔ 1980ء کی پوری دہائی کے دوران انہوں نے جہادی عناصر کی کھلے عام حمایت کی جس کی وجہ سے ملک کے اندر فرقوں اور مذہبی بنیادوں پر تقسیم نے جنم لیا جس کا نتیجہ معصوم جانوں کے اتلاف کی صورت میں نکلا۔ 2001ء میں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے آغاز کے بعد سے ان عناصر نے دہشت گردی کے مسئلے پر رائے عامہ کو منقسم کرنے اور جوڑ توڑ کیلئے ایک مہم چلا رکھی ہے۔ اس پوری مدت کے دوران عسکریت پسند میڈیا کی طرف سے پہنچایا جانے والا شاید سب سے بڑا نقصان معاشرے کے مختلف طبقات کو انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے سے روکنا تھا۔ پالیسی پر مسلسل تنقید اور مغرب کے خلاف پراپیگنڈے کے ذریعے ان عناصر نے ایک الجھن اور غیر یقینی کی سی کیفیت پیدا کی اور وسیع تر فیصلہ سازی میں رکاوٹ پیدا کی۔ چاہے شورش زدہ علاقوں میں فوجی آپریشن کرنے کا معاملہ ہو یا حکومت کی حامی قوتوں کی حمایت کا مسئلہ ہو، عسکریت پسند میڈیا نے عوام کو گمراہ کرنے کی مسلسل پالیسی اپنائے رکھی۔

عسکریت پسند میڈیا کا پراپیگنڈہ جاری ہے اور بہت سی صورتوں میں یہ جھوٹ کو سچ کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب بھی رہا ہے۔ یہ بات شہباز بھٹی اور سلمان تاثیر کی کیسوں سے عیاں ہے جن کے متنازعہ توہین رسالت ﷺ قانون سے متعلق بیانات کو بے شمار مواقع پر غلط انداز میں پیش کیا گیا جس سے عوام کے جذبات مشتعل ہوئے اور اس کا نتیجہ ان رہنماؤں کے قتل کی صورت میں برآمد ہوا۔ مرحوم سلمان تاثیر کی طرف سے اس بات پر اصرار کے باوجود کہ وہ صرف اس قانون کے غلط استعمال کے خلاف ہیں اور اس کا استحصال روکنے کیلئے اس میں ترامیم چاہتے ہیں، ذرائع ابلاغ میں ان کی طرف سے کی جانے والی وضاحتیں کبھی بھی شہ سرخیوں کا حصہ نہ بن سکیں۔ سلمان تاثیر کی موت کے بعد بھی عسکریت پسند میڈیا نے ان کے قاتل ممتاز قادری کو ہیرو کا درجہ دے ڈالا۔ ذرائع ابلاغ ایسی تصاویر سے بھرے پڑے تھے جن میں قاتل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اور پھولوں سے لادے جاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ذرائع ابلاغ میں قتل کے ان واقعات کی مذمت دبا دی گئی یا پھر مبہم انداز میں پیش کی گئی۔ دوسری طرف شہباز بھٹی کے قتل کو سرکردہ اخبارات اور چینلز میں آنے والی خبروں میں بلیک واٹر کا کارنامہ قرار دیا گیا۔

موجودہ قانون کے تحت ذرائع ابلاغ میں تحریک طالبان پاکستان اور جماعت الدعوۃ جیسی کالعدم تنظیموں کی خبروں کی اشاعت کی اجازت نہیں لیکن عسکریت پسند میڈیا ان گروپوں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے ان کی سرگرمیوں کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتا ہے۔ 2005ء میں زلزلے کے دوران اور 2010ء میں سیلاب کے موقع پر جماعت الدعوۃ کی فی سبیل اللہ سرگرمیوں کو ذرائع ابلاغ کے مختلف حصوں میں کوریج دی گئی۔ اسی طرح تحریک طالبان پاکستان جیسے کالعدم اور دہشت گرد گروپوں کی پریس کانفرنسوں کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ مختصر یہ کہ جہادی میڈیا ان گروپوں کو تعلقات عامہ کی مطلوبہ خدمات فراہم کر رہا ہے۔ ان دہشت گردوں کو بطور ہیرو پیش کیا جا رہا ہے اور دہشت گردی کا الزام ''غیر ملکی طاقتوں'' اور ''خفیہ ہاتھوں'' پر دھرا جا رہا ہے۔

2008ء میں بیت اللہ محسود ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے ہیں۔ کالعدم جماعت کی حیثیت سے تحریک طالبان کی ذرائع ابلاغ میں کوریج کی اجازت نہیں ہے۔ ماخذ: ورلڈ نیوز نیٹ ورک

شائستہ میڈیا کی طرف سے ملک کا ترقی پسند تشخص اجاگر کرنے کی کسی بھی کوشش کو عسکریت پسند میڈیا ناکام بنا دیتا ہے۔ مغرب کے بارے میں اس مخاصمانہ تصویر کشی اور جہادیوں کی حمایت کو مغربی ذرائع ابلاغ اچک لیتے ہیں اور اس کا نتیجہ اس کی غلط تشریح کی صورت میں نکلتا ہے۔ پاکستان کو ایسے ملک کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جس پر ملاؤں اور ان کے بندوق بردار بھائیوں نے قبضہ جما رکھا ہے اور اسے ایک ناکام ریاست کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ پاکستان اور دہشت گردی کو لازم وملزوم سمجھا جا رہا ہے۔ جہادی میڈیا نے پاکستان کو بین الاقوامی برادری میں ایک ایسی بندوق کے طور پر پیش کیا گیا جس میں سے دھواں نکل رہا ہے۔ اس دروغ گوئی اور دھوکہ دہی کا نتیجہ معصوم جانوں کے ضیاع کی صورت میں نکلا ہے اور دوسری طرف دہشت گردی میں کمی لانے کیلئے ہماری تمام تر قربانیوں کے باوجود عالمی برادری میں ہمارے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے ہیں۔ اگر اس پر قابو نہ پایا گیا تو مستقبل میں بین الاقوامی برادری میں پاکستان کی پوزیشن کا دفاع کرنے میں اس سے بھی دشوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لازمی ہے کہ ذرائع ابلاغ کا غلط استعمال کرنے والے ایسے عناصر کو بے نقاب کیا جائے اور ان کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک موثر حکمت عملی ترتیب دی جائے۔ عسکریت پسند میڈیا پر قابو پانے والے پرچم بردار خود میڈیا میں ہی تلاش کرنا ہوں گے۔ میڈیا کی تنظیموں کو ضابطہ اخلاق مرتب کرنا پڑے گا اور اس میں تمام طبقات کے نکتہ ہائے نظر کو جگہ دینا ہوگی لیکن ایسا کرتے ہوئے متعصب نکتہ نظر کی طرف جھکاؤ سے گریز کرنا ہوگا۔ میڈیا کو آگے آنا ہوگا اور ملک کے شہریوں میں عسکریت پسند طبقات کے مذموم مقاصد کے بارے میں شعور پیدا کرنا ہوگا اور ذرائع ابلاغ کی آزادی سے منسلک ذمہ داری پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

تنازعات کے خواتین پر اثرات

از: مہر خان

زیرِنظر مضمون میں خواتین پر جنگ کے اثرات اور جنگ زدہ علاقوں میں رہنے والی خواتین کی حالت زار کے بارے میں ذرائع ابلاغ میں پیش کی جانے والی تصویر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی جنگ سے سب سے پہلے خواتین اور بچے متاثر ہوتے ہیں۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جو خود اپنے آپ سے جنگ میں مصروف ہے۔ اپنے آپ سے جنگ کا مطلب کسی معاشرے میں افراد کے مخصوص گروپوں کے مابین جو ایک دوسرے سے نظریاتی بعید رکھتے ہوں، تصادم ہے۔ اس اندرونی جنگ کے نتیجے میں پاکستان میں عوام کی بہت بڑی اکثریت جسمانی اور نفسیاتی دونوں اعتبار سے متاثر ہوئی ہے۔

پاکستان کا اندرونی تصادم ایک ایسے بیرونی تصادم سے منسلک ہے جسے 'دہشت گردی کے خلاف جنگ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ جنگ ملک کی شمال مغربی سرحدوں پر لڑی جارہی ہے۔ وفاق کے زیرِانتظام قبائلی علاقے (فاٹا)، وفاق کے زیرِانتظام شمالی علاقے (فانا) اور بلوچستان کے سرحدی علاقے اس جنگ سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں۔

سرحد پار دہشت گردی پاک افغان سرحد کے دونوں جانب جاری ہے۔ اس علاقے کو اب افپاک (افغانستان، پاکستان) کہا جاتا ہے۔ اس علاقے میں پاکستان، افغانستان، بھارت حتیٰ کہ ایران جیسے ممالک بھی اپنے سیکورٹی اداروں کے ذریعے سرگرم ہیں جبکہ اس سے پہلے سوویت یونین جیسی بڑی طاقتیں اور اب امریکہ اور دیگر مغربی طاقتیں اس گیم کے قواعد وضوابط مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے 21ویں صدی کی گریٹ گیم کہا جاتا ہے جو عین ہماری ناک تلے جاری ہے اور جس میں ہمارے اپنے معاشرے کے کچھ طبقات بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں۔

1980ء کی دہائی میں مقامی افراد بالخصوص سرحد کی پاکستانی جانب رہنے والے سرحدی قبائلی نیز ملک کے دوسرے حصوں سے تعلق رکھنے والے نوجوان افراد گروہوں کی صورت سرحد پار کرکے 'کفار' کے خلاف 'جہاد' کیلئے گئے۔ تاہم خواتین اور بچے جو اس جنگ میں شرکت سے متعلق فیصلے میں کبھی بھی شریک نہیں رہے، اس جنگ سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ بہت سی صورتوں میں مردوں کی عدم موجودگی میں خواتین کو اپنی زمینوں، بچوں اور جائیداد کی دیکھ بھال کرنا پڑی۔

ایک طرف عسکریت پسندوں کے خلاف فوجی آپریشن اور دوسری طرف ڈرون حملوں کے دوران بے گھر ہونے والے مردوں، خواتین اور بچوں کو اپنے تحفظ کیلئے ان سرحدی علاقوں میں اپنے گھربار، شہروں اور اثاثہ جات کو چھوڑ کر ملک کے دوسرے علاقوں کا رخ کرنا پڑا۔ اس جنگ میں کمزور ترین طبقات کون تھے؟ لامحالہ طور پر یہ خواتین اور بچے ہی تھے۔

بشکریہ ایڈون کو

اگرچہ پاکستان اپنے روایتی دشمن بھارت کے ساتھ بھرپور جنگ کی حالت میں نہیں ہے لیکن قومی بجٹ کا ایک بہت بڑا حصہ اب بھی فوج کی دفاعی ضروریات پوری کرنے میں صرف ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان افغانستان، بھارت اور حال ہی میں امریکہ کے ساتھ الفاظ کی سفارتی جنگ میں الجھا ہوا ہے۔ جب بھی کشیدگی میں اضافہ ہوتا ہے، امداد دینے والے اداروں اور اقتصادی امداد فراہم کرنے والے دیگر اداروں کی طرف سے ان جنگ زدہ علاقوں میں سرگرم عمل پاکستانی تنظیموں کو مالی امداد کی بندش کی دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ دراصل ایسی صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب افغانستان سے سوویت یونین کے انخلاء کے بعد امریکہ نے افغانستان اور پاکستان کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ فلاحی منصوبوں کیلئے امداد رک جانے سے سب سے زیادہ کون متاثر ہوا؟ ظاہر ہے کہ یہاں ایک مرتبہ پھر خواتین اور بچے ہی متاثر ہوئے۔ 1980ء اور 1990ء کی دہائیوں کے دوران مجاہدین کے گروپ خودرو پودوں کی طرح نمودار ہوئے اور افپاک (افغانستان، پاکستان) کے علاقے میں چھا گئے۔ حیران کن طور پر جنگ کیلئے ہتھیاروں اور گولہ بارود کی صورت میں امدادی وسائل بے تحاشا طور پر اتنے بڑھ گئے جس کی ماضی

میں مثال نہیں ملتی اور دہائیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرہ رجعت پسند ہوتا چلا گیا۔ ان دشوار حالات میں حکومت معاشرے کی بہتری کیلئے کام کرنے کی بجائے دوسرے کاموں کے علاوہ متنازعہ حدود قوانین کیلئے قانون سازی میں مصروف ہوگئی۔ ان قوانین نے آج تک پاکستان کی خواتین کی حالت زار میں بہتری لانے سے زیادہ انہیں نقصان پہنچایا ہے۔

جنگ زدہ علاقوں میں خواتین کی ضروریات اور مسائل پر شاذونادر ہی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کی مثالیں سوات میں فوجی آپریشن سے پہلے اور آپریشن کے بعد دیکھنے مین آئیں۔ فوجی آپریشن شروع ہونے سے پہلے طالبان کی طرف سے خواتین کو سرعام نشان عبرت بنانے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں جیسا کہ سوات میں ایک لڑکی کو کوڑوں کی سزا کی صورت میں دیکھا گیا۔

کام کرنے والی خواتین کو گھروں میں محدود رہنے کو کہا گیا جبکہ ان لوگوں کو تنبیہ کیلئے جو اپنے بیٹیوں کو سکول بھجواتے تھے، لڑکیوں کے سکولوں کو ایک منظم طریقے سے دھماکوں سے اڑا دیا گیا۔

تاہم دلچسپ امر یہ ہے کہ سوات میں جنگ کے آغاز سے پہلے مولانا فضل اللہ جیسے انتہا پسند عناصر کی حوصلہ افزائی میں خواتین نے اہم کردار ادا کیا اور معاشرے کو طالبان کے رنگ میں ڈھالنے کیلئے ان عناصر کو مالی امداد فراہم کی۔ طالبان کے اس متنازعہ مذہبی رہنما کو نمایاں کرنے میں ذرائع ابلاغ نے اہم کردار ادا کیا۔ اپنے مقاصد کیلئے مولانا فضل اللہ نے ایف ایم ٹرانسمیٹر کا غیر قانونی استعمال کیا۔ اس ریڈیو کو وہ خود چلاتا رہا۔ خواتین سے براہ راست خطاب میں وہ انہیں اپنے مردوں کو امراء اور بااثر افراد نیز کفار کے خلاف جہاد پر بھجوانے کی ترغیب دیتا تھا۔ ملا کی طرف سے چلائی جانے والی اس میڈیا مہم نے اپنا اثر دکھایا اور خواتین کی بڑی تعداد نے اس میں سرگرمی سے حصہ لیا اور اس مہم کیلئے اپنے سونے کے زیورات وغیرہ تک چندے میں دے دیئے۔ ملا کے ریڈیو کی طرف سے لڑکیوں کو برسرعام سکول اور کالج چھوڑ دینے کو کہا گیا اور جنہوں نے سکول اور کالج چھوڑ دیئے اسی ریڈیو چینل سے ان کی تعریف کی گئی۔

فوجی آپریشن کے بعد 2009ء میں بے گھر افراد کی بہت بڑی تعداد اپنے گھر بار سے محروم ہوگئی اور وہ تقریباً سال بھر کیمپوں میں رہنے پر مجبور رہی۔ اس سال شدید گرمی کے طویل موسم میں انہیں حکومت اور پرائیویٹ اداروں کی طرف سے کھانا اور دیگر امداد فراہم کی گئی۔

ایسی خواتین جو اس سے پہلے کبھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلی تھیں، انہیں اب (بعض صورتوں میں) پردے کے بغیر قومی اور بین الاقوامی ٹیلی ویژن کی سکرینوں پر دکھایا جانے لگا۔ واحد چیز جو انہیں دنیا کی نظروں سے پردہ فراہم کرتی تھی باریک سوتی کپڑے کے پردے تھے جو انہیں تماشائیوں کی نظروں سے بچانے کیلئے لٹکائے گئے تھے۔ اس وقت ذرائع ابلاغ کے نمائندے بے گھر افراد کیلئے قائم کیے جانے والے کیمپوں میں بے دریغ گھس آتے تھے اور ان بے بس لڑکیوں سے اس قسم کے سوال پوچھتے تھے ''آپ کیسا محسوس کرتی ہیں''۔ کئی خواتین کے ویران چہرے جنہوں نے اپنے بڑے بڑے گھرانوں کے ساتھ پہاڑوں سے اتر کر میلوں تک پیدل سفر کیا اور اپنے بچوں کے کپڑوں اور کھانے پینے کی اشیاء کے حصول کیلئے جدوجہد کرتی رہیں اور بعض صورتوں میں انہوں نے دوران سفر اور کیمپوں میں بچوں کو جنم دیا، ایسی ان کہی کہانیاں بیان کرتے ہیں جو الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتیں۔

سوات، بونیر اور لوئر دیر میں جاری تنازعات سے متاثر ہونے والی بچیاں مردان میں موجود ریلیف کیمپ کے باہر راشن حاصل کرنے کیلئے قطار میں بیٹھی ہیں۔
ماخذ: گٹی امیجز

2000ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے خواتین، امن اور سلامتی کے موضوع پر قرارداد نمبر 1325 منظور کی۔ یہ قرارداد خواتین اور بچوں پر جنگ کے خصوصی اثرات سے متعلق ہے اور اس میں جنگوں سے بچنے، امن کے قیام اور جنگ کے بعد تعمیر نو کے عمل میں خواتین کی شرکت کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ اگرچہ پاکستان نے بھی خواتین کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خاتمے سے متعلق دستاویز (Convention on the Elimination of All Forms of Discrimination Against Women - CEDAW) پر دستخط کر رکھے ہیں جس میں صنفی مساوات اور خواتین کو بااختیار بنانے پر زور دیا گیا ہے، حکومت ترقی نسواں کی وزارت کے ذریعے قرارداد نمبر 1325 پر عملدرآمد کرنا چاہے گی۔ تاہم چونکہ پاکستان کو اس وقت جن مسائل کا سامنا ہے وہ داخلی نوعیت کے ہیں اور حکومت پاکستان کو ابھی پاکستان کو ایک ''جنگ زدہ'' ملک کی حیثیت سے تسلیم کرانا ہے، اس لیے پاکستان جیسے ملک میں جسے اندرونی و بیرونی دونوں طرح کی جنگ کا سامنا ہے، ملک کی نصف سے زیادہ خاموش آبادی بالخصوص شورش زدہ علاقوں میں خواتین پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ایسے مصائب کو نظر انداز کر دینے یا انہیں کم سے کم کر دینے سے مستقبل میں مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کو ان مسائل پر توجہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ معاشرے کو اس جنگ (کے اثرات سے) بحیثیت مجموعی متعارف کرایا جا سکے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے کی ضرورت ہے کہ جی ہاں، خواتین ایک ایسی خاموش اکثریت ہیں جنہیں جنگ اور تباہی کا براہ راست سامنا کرنا پڑتا ہے۔

چونکہ دنیا کے اس حصے جہاں ہم بستے ہیں، جنگ ابھی جاری ہے، اس لیے جنگ سے بچاؤ کے سلسلے میں مردوں اور خواتین کے کردار کی اہمیت انتہائی دوچند ہو گئی ہے۔ اس میں ذرائع ابلاغ کے توسط سے مردوں اور خواتین دونوں کے بارے میں اور انہی کے ذریعے معلومات کو جنگ سے بچاؤ اور قیام امن کیلئے استعمال کرنے کے طریقے بھی شامل ہیں۔ تاہم پاکستان میں ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں دراصل خواتین کو اس کردار سے الگ تھلگ رکھا گیا ہے یا انہیں وہ کچھ کرنے کی اجازت نہیں دی جا رہی جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہیں۔

دوسری طرف ہمارے معاشرے میں ثقافتی اعتبار سے خواتین نچلی سطح پر کمیونٹی کے بارے میں فیصلہ سازی کے عمل میں دباؤ کا شکار نظر آتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ ثقافتی اور مذہبی تناظر میں خواتین کی حیثیت اور بطور فیصلہ ساز انہیں تسلیم نہیں کیا جاتا۔ یہ حقیقت بذات خود معاشرے کے اندر صنفی کردار کے بارے میں ایک تضاد اور جنگ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح خواتین زمین سے متعلق جھگڑوں کے حل میں شاذ ہی شریک نظر آتی ہیں۔ خونی جھگڑوں، زمین کے تنازعات اور ازدواجی مسائل سے متعلق اہم فیصلے مرد کرتے ہیں۔ ایسے فیصلے جرگوں اور پنچایتوں (دیہات کی سطح پر یہ مکمل طور پر مردوں پر مشتمل ہوتے ہیں) میں کیے جاتے ہیں۔ اسی معاشرے میں مثلاً خاندانوں کے مابین شادیوں اور غیرت کے نام پر ہلاکتوں وغیرہ سے متعلق خونی جھگڑوں کو نمٹانے کیلئے غیر منصفانہ سماجی روایات پر عمل درآمد کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ونی جیسی غیر منصفانہ رسم جس میں خونی جھگڑے کمسن بچوں کی شادیوں کی صورت میں طے کیے جاتے ہیں، پاکستان کے قبائل علاقوں نیز صوبہ پنجاب میں عام ہیں۔ اگرچہ ایسی خبریں ذرائع ابلاغ میں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن ابھی اس بات کو نمایاں کیا جانا باقی ہے کہ جھگڑوں کے حل کیلئے خواتین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

مقامی ثقافت میں خواتین کے بارے میں سختی پر مبنی ایک روایتی سوچ پائی جاتی ہے۔ خواتین سے متعلق مسائل کے بارے میں فیصلے (جرگوں کے ذریعے) زیادہ تر مرد ہی کرتے ہیں۔ عدلیہ کے ذریعے جھگڑوں کے حل کے نئے طریقوں کو جرگوں کے ذریعے فیصلوں پر فوقیت حاصل ہوتی دکھائی نہیں دیگی۔ مستقبل میں مقامی سطح پر ثالثی کے ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے جس میں خواتین کی بھرپور شرکت ہو کیونکہ یہ خواتین ہی ہیں جو تنازعات سے براہ راست متاثر ہوتی ہیں۔

میڈیا جسے قوم کا چوتھا ستون کہا جاتا ہے، ایک انتہائی طاقتور ہتھیار ہے، اسے ہم جس طریقے سے چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں میڈیا کو چیلنجوں اور پیدا ہونے والے تنازعات کو اجاگر کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com
انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

بے ربط نوجوان

از: خرم سلیم

آج دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ، درحقیقت ایک چوتھائی 14-10 سال کی عمر کے نوجوان لوگوں پر مشتمل ہے۔ اس حقیقت کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ، ان میں سے 86 فی صد ترقی پذیر ممالک میں رہتے ہیں۔ پاکستان کو، اپنے طور پر، اس وقت اپنی تاریخ میں نوجوانوں کی سب سے بڑی تعداد کا سامنا ہے۔ ملک کی موجودہ آبادی کا 60 فی صد سے زائد حصہ 24-15 سال کی عمر سے تعلق رکھتا ہے۔

ماخذ: داسٹیٹسمن (The Statesmen)

اہم بات یہ ہے کہ پاکستان ایک نوجوان لوگوں کی قوم ہے؛ اکثر کہی جانے والی کہاوت - ''ہمارا مستقبل نوجوانوں سے وابستہ ہے'' - شاید آج کسی بھی ملک سے زیادہ پاکستان کے لئے درست تصور کی جاتی ہے۔ جب کہ نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پاکستانی قوم کو مختلف اقسام کے مواقع فراہم کرتی ہے، تاہم اگر نوجوان لوگوں کی اس نازک تعداد کو احتیاط سے نہ سنبھالا گیا تو ممکنہ شدید خطرات میں خاطر خواہ اضافہ ہوسکتا ہے۔ یہاں اس بات پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ آبادی کے مشہور ماہرین نے کم عمر کے نوجوانوں کے ڈھانچوں پر مشتمل ممالک کو سماجی جنگ کے لئے بہت بڑا خطرہ قرار دیا ہے۔ آبادی کے ماہرین کی ریسرچ ظاہر کرتی ہے کہ ان ممالک میں جہاں نوجوانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جھگڑوں کے خطرات ان ممالک سے 150 فی صد زائد ہیں جن میں نوجوان مناسب تعداد میں ہیں۔ اور جب ہم موجودہ بے چینی کے تناظر میں جائزہ لیتے ہیں تو پاکستان کے سلسلے میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

پاکستان میں ایک اوسط نوجوان فرد کے لئے بااختیار ہونا اور برابری کی بنیاد پر حقوق تک رسائی کا حصول غیر معمولی خواہشات ہیں، بالکل دور ایک خواب کی طرح جس کا جلد پورا ہونے کے بہت کم امکانات ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کی بے روزگاری میں تسلسل پایا جاتا ہے جس میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ سیاست دانوں کے فصیح و بلیغ بیانات جن میں نوجوانوں کو یقین دہانی کرائی جاتی ہے کہ انہیں نوکریاں فراہم کی جائیں گی سیاست دانوں کے طاقت کے ستونوں کے پیچھے چھپ جانے کے بعد باسی خبر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ نوجوانوں کی بے چینی میں خصوصاً اس وقت اور اضافہ ہو جاتا ہے جب انہیں الیکٹرانک میڈیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے جو انہیں وجود میں آنے والی ایک مختلف دنیا کے طور پر پیش کرتے ہیں جہاں ایسی طلب اور خواہشات پیدا ہوتی ہیں جو پوری نہیں کی جاسکتیں۔

ایک عجیب بات جس سے ہمیں پورے پاکستان میں واسطہ پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ نوجوان آزادانہ خیالات رکھنے کے باوجود آزاد خیال کی حیثیت سے اپنی پہچان کروانا پسند نہیں کرتے۔ امیر نوجوان غریبوں کی نسبت زیادہ آزاد خیال ہیں۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ غریب نوجوان مذہبی تصورات کے ہتھے چڑھنے کا رجحان رکھتے ہیں اور اس کی آڑ میں اپنا غبار نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ پاکستان میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد یہ جانے بغیر کہ وہ آزاد خیالی کے حامی ہیں، آزاد خیال ہے۔ حقیقت کے مزید قریب آتے ہوئے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے پاکستانی جمہوریت کے حامی ہیں، وہ شفافیت اور ترقی پسند تحریکوں پر یقین رکھتے ہیں؛ لیکن پھر بھی، ان اقدار کا پرچار کرنے والے لوگ آزاد خیال کی حیثیت سے اپنی پہچان کروانا یا بلوانا پسند نہیں کرتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان میں نوجوانوں کی اکثریت کے لئے آزاد خیالی ایک بیرونی تصور ہے۔ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ مغربی تہذیب اور روایات کو پاکستان میں فروغ دینے کی ایک مغربی سازش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں آزاد خیالی کے لئے حقارت آمیز انداز استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسا زیادہ تر آزاد خیالی کی غیر نمائندہ حیثیت کی وجہ سے ہوتا ہے کہ 'آزاد خیالی' کا لفظ لوگوں کو بری طرح چھبتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں، اس کا نام لینا گناہ سے بھی زیادہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں پر آزاد خیال ہونے کا مطلب کافر ہو جانا لیا جاتا ہے۔ آزاد خیالی کے بارے میں ہماری سمجھ بوجھ اتنی محدود ہے کہ ہم اکثر آزاد خیالی کو ایک فاسقانہ عمل سمجھتے ہیں۔ آزاد خیال لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے بہترین خیالات کو پھیلانے اور اپنے ناظرین و سامعین کے دل میں جگہ

بنانے کے لئے ایمان افروز زبان میں بات کریں اور قومی عزت، پرہیزگاری، وقار اور سامراجیت کے خلاف شدید تصورات پیش کریں۔ پاکستان میں آزاد خیالی کو پاکستانی اور دیرپا بنانا ہے نہ کہ مغرب سے درآمد کردہ جیسا کہ آج کل تصور کیا جاتا ہے۔

کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ایک ایسی غیر صحت مندانہ فضا قائم ہوگئی ہے جس میں طالب علموں کی تشریح ان کے اصولوں اور تصورات کی بجائے ان کی زندگی گزارنے کی ترجیحات کے مطابق کی جاتی ہے۔ آزاد خیال اور اس کے ساتھ مذہبی دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اس غلطی کے برابر ذمہ دار ہیں۔ کچھ خود ساختہ آزاد خیال افراد بھی موجود ہیں جو یہ سوچتے ہیں کہ انگریزی لہجہ اپنانا، شراب نوشی، سگریٹ نوشی، جینز پہننا اور اونچی آواز میں موسیقی سننا تہذیب اور جدت کی انتہا ہے۔ تاہم، مذہبی دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے افراد بھی اسلامی اصولوں کے اپنانے کی بجائے محض داڑھی اور حجاب کی ظاہری علامات پر توجہ دیتے ہوئے یہی غلطی دہراتے ہیں۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستانی لوگوں میں موجود ثقافتی تضاد کے رجحان کو سمجھنے کے لئے، ضروری ہے کہ ہم اس میں شامل انفرادی تصورات اور ان کے اپنی شخصیت پر پیدا ہونے والے اثرات کو سمجھیں۔ چنانچہ، ہمیں اس کی معنویت کی شناخت اور اہمیت کی اصطلاحات کو سمجھنے کی ضرورت ہے؛ جیسا کہ کسی فرد کے بارے میں تصور یا اس کی پہچان اس کی ابتدائی زندگی میں مختلف ذرائع (پرنٹ، بصری اور الیکٹرانک میڈیا) سے حاصل کردہ مطلوبہ اوصاف کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح، ایک قوم کو ایک مضبوط اور آزاد دنیا میں رہنے کے لئے لازمی طور پر اپنا ایک مجموعی تصور بھی قائم رکھنا چاہیئے۔ اگر یہ تصور پھیکا پڑ جائے، تو وہ فرد اور قوم آخر کار اپنے آپ کو تباہی کی طرف دھکیل دیں گے۔

یہاں فیس بک پر موجود زوہیر طورو کی ایک ویڈیو کا ذکر کیا جا رہا ہے جسے احتجاج کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس ویڈیو میں نوجوان طالب علم کو پولیس کے خلاف الٹی سیدھی باتیں ہانکتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ سخت گرمی میں ویکس کی مدد سے کھڑے کئے بالوں اور رنگین چشمہ پہنے اس طالب علم کی تصویر جنگل کی آگ کی طرح انٹرنیٹ پر پھیل گئی اور عام لوگوں کی تفریح کا باعث بنی۔ جب ملک کے نوجوان، جو کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ ہیں، پہچان کے ایک شدید بحران سے گزریں اور بلا کھوج لگائے کسی انجان مقصد کے لئے سڑکوں پر آجائیں، تو یہ عمل اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے کس حد تک تقسیم ہو چکے ہیں۔ اتنا زیادہ سنکی اور خشک مزاج ہونے پر معذرت خواہ ہوں لیکن زوہیر طورو کی جانب سے ڈیوس کے مسئلے پر 'غصے' کے اس بے وقوفانہ اظہار پر تماشہ لگنے پر میں بے حسی کے سوا کچھ محسوس نہیں کرسکتا۔

تاہم، سب کچھ بے ترتیب نہیں ہے۔ ایک کشاں مگر واضح تحریک موجود ہے جو نوجوانوں کو بااختیار بنانے اور ان پیچیدگیوں سے نمٹنے کے لئے نوجوان لوگوں کو تیار کر رہی ہے جو مستقبل میں پاکستانی قوم کو اپنے حلقے میں لے سکتے ہیں۔ ملک میں میڈیا کے غیر روائیتی افزائش کے ساتھ یہ بتدریج تبدیلی زیادہ واضح ہوگئی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کی اچانک افزائش نے فوری عالمی مواصلات کے نئے امکانات میں اضافہ کردیا ہے اور اس طرح میڈیا کے پھیلاؤ کے نتیجے میں یہ نئی تھیوریز بھی سامنے آئی ہیں کہ لوگوں کا ردعمل کیا ہوگا اور وہ کیا تبدیلی چاہیں گے۔

میڈیا نے یہ انداز اپنایا ہے کہ کس طرح استاد کو پڑھانا، حکومت اور مذہبی قائدین کو تبلیغ کرنا اور یہ کہ پاگل پن اور محبت کا سلوک کرنا چاہیئے۔ میڈیا کے پاس وہ کچھ کہنے کی استعداد بھی ہے جو پاکستان جیسے مخصوص روایات والے معاشرے میں بھی نہیں کہا گیا۔ دوسری جانب، میڈیا نے اب ایجنڈہ تشکیل کرنے کا اہم کردار بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ یہ ان مسائل کو ترجیح دینے کا اختیار رکھتا ہے جنہیں یہ فروغ دینا چاہتا ہے۔ یہاں پر ہم حکمرانی کی حامی تھیوری پر غور کرتے ہیں: پاکستان کے حکمران اطلاعات کی طاقت سے اچھی طرح واقف ہیں اور بسا اوقات میڈیا پر اپنا اثر و رسوخ جماتے ہیں۔ اطلاعات کے حق پر قابو حاصل کرنے کی اس صلاحیت کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو ترقیاتی مسائل اور موجودہ عہد کے مباحث کے بارے میں ہدایات نہیں دی جاتیں۔ اگرچہ ٹیکنالوجیز کی ایجاد سے، اس کنٹرول کا اثر کم ہوکر رہ گیا ہے، لیکن نوجوانوں کے پروگراموں کی عام صورت حال کے حوالے سے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ آگاہی میں یہ کمی اس وقت اور زیادہ عیاں ہوجاتی ہے جب کوئی میڈیا کی جانب سے صنف اور نوجوانوں کے حوالے سے تشدد جیسے مسئلے پر دی جانے والی توجہ کی شدت جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ نتیجتاً، وہی میڈیا جو نوجوانوں کی ترقی میں ایک اہم اور جامع کردار ادا کرسکتا ہے، درحقیقت نوجوانوں کو تشدد کی جانب راغب کرنے کا مجرم بن جاتا ہے۔

تشدد کا وحشیانہ رقص، سیاست دانوں کے درمیان فضول گرما گرم بحث اور ہمارے نوجوان لوگوں کے حقیقی مسائل کی جانب عدم توجہ، بلاشبہ نقصان دہ ہے۔ اگر ایک اچھے جذبے سے مل جل کر درست سمت میں مخلصانہ کوششیں کی جائیں تو پاکستان کو معاشی بدحالی سے باہر نکالا جاسکتا ہے۔ پاکستانی میڈیا اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ نوجوانوں پر بھی لازم ہے کہ وہ اپنے منتخب کردہ شعبوں میں کسی پیشے کو اختیار کرنے کی تیاری کے لئے مطلوبہ مہارتوں کے حصول میں سنجیدگی اختیار کریں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں، کہ کام کرنے والا کوئی نوجوان عام طور پر شدت پسند عناصر کے ساتھ دوستی رکھنے پر مجبور نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی ایسا نوجوان جو اپنے پیشے سے منسلک ہو کسی غیر اخلاقی اور قابل اعتراض سرگرمیوں میں ملوث ہوگا۔ تب ہی پاکستان اپنی آبادی سے، جس کی اکثریت قابل نوجوانوں پر مشتمل ہے، بہت زیادہ فائدہ حاصل کرپائے گا۔

بدقسمتی سے میڈیا کے بہت سے ذرائع نوجوانوں کے ترقیاتی مسائل کے بارے میں اہم معلومات سے آگاہ نہیں ہیں۔ لہٰذا نوجوانوں میں ترقی تسلی بخش نہیں ہے اور نوجوانوں کا رویہ تشدد، عالمی میڈیا تعصّبات، عریانی اور دیگر منفی اقدار کے زیر اثر ہے۔

غلط اقدار کو اپنانا، نشہ آور اشیاء کا استعمال، میڈیا پر تشدد اور مقامی قبائل کے مسلح جھگڑوں کی رپورٹیں بھی نوجوانوں پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے منفی اثرات تک رسائی حاصل کی جائے اور میڈیا پر مثبت اثرات کو فروغ دینے کے لئے میڈیا کی رہنمائی کی جائے اور میڈیا پر تصوراتی اقدار کا پرچار کیا جائے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

ماخذ: http://mag.citizenseye.com/wp-content/uploads/2010/07/pakistani-youth-activism1.jpg

سماجی میڈیا میں دہشت گرد

از: میاں اعتصام وحید

پاکستانی براڈ کاسٹ میڈیا جو تقریباً ایک دہائی قبل تک سرکاری سرپرستی میں کام کر رہا تھا۔ حالیہ سالوں میں نہایت فعال کردار کے ساتھ ابھرا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں الیکٹرانک میڈیا زیادہ فعال کردار ادا کرنے کے ساتھ بڑی حد تک خودمختار صنعت بن چکا ہے۔ اس نمایاں تبدیلی کی وجہ سے سماجی میڈیا میں تیزی سے ترقی رونما ہوئی ہے۔ سماجی میڈیا اور براڈ کاسٹ میڈیا کے مشترکہ کام نے پاکستانی سول معاشرے کے اہم عنصر کو تقویت بخشی ہے۔ اب میڈیا کے دونوں شعبے دہشت گرد کاروائیوں اور دوسرے قومی معاملات کو نمایاں طور پر کور (Cover) کر رہے ہیں۔ تاہم سماجی میڈیا کا کردار بالخصوص دہشت گردی کی کوریج کے حوالے سے ابھی تک زیر سوال ہے۔

دوسرے ممالک سے ہٹ کر، پاکستان میں روایتی میڈیا نے سماجی میڈیا کا بھرپور استقبال کیا ہے۔ سماجی میڈیا کی ترقی روایتی میڈیا کیلئے کسی خطرے کا باعث نہیں بنی بلکہ روایتی میڈیا نے تیزی کے ساتھ سماجی میڈیا کے ساتھ ملاپ پیدا کرلیا ہے۔ اس کی مثال اس طرح سے ہے کہ بہت سے اخبارات اور جرائد اب قارئین کی تعداد بڑھانے کیلئے براہ راست اپنا مواد سماجی میڈیا کے ساتھ منسلک کر رہے ہیں۔ جس سے اخبار اور صارف کو بیک وقت فائدہ حاصل ہوا ہے۔ طبع شدہ مواد محض چند سیکنڈوں میں بلا معاوضہ ہزاروں قارئین کیلئے دستیاب ہوتا ہے۔ اس رابطے کا ایک اور اہم عنصر یہ ہے کہ مواد کے بارے میں رائے نہایت تیزی کے ساتھ تبصرے کی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے۔

اخبارات، جرائد اور الیکٹرانک میڈیا چینلز کے اپنے الگ الگ بلاگ ہیں جن پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ عام لوگ بلاگ دیکھ کر ان تبصروں کو پڑھ سکتے ہیں۔ ان تبصروں کے ذریعے کوئی بھی فرد اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے اور یہاں سے ہی دلیل اور مباحثے کی ابتداء ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ، سماجی میڈیا کے بہت سے آلات (Tools) ملک میں فعال طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ پاکستان سماجی میڈیا میں استعمال ہونے والے کچھ خاص ٹولز بلاگ، مائیکرو بلاگنگ، پاڈ کاسٹ، سوشل نیٹ ورکنگ اور ویڈیو شیئرنگ ہیں۔ ان آلات کو مؤثر طور پر استعمال میں لانے والے اداروں میں نئے گروپوں، سول سوسائٹی ادارے، فعال میڈیا سٹیزن باڈیز سے لے کر مذہبی تنظیموں تک سب شامل ہیں اور ان سب میں ایک مشترک چیز یہ ہے کہ یہ سب سماجی میڈیا کو خاص ایجنڈے کے تحت استعمال کر رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان ٹولز نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کو بہتر انداز میں سمجھنے کیلئے شہریوں کی معاونت کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے غلط اطلاعات تیزی سے غیر ذمہ دارانہ مواد کی شیئرنگ سے پھیلی ہیں۔ میرے خیال میں پاکستان میں سماجی میڈیا نے شہریوں کو فائدہ پہنچایا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ کانسپائرسی تھیوریز کو بھی فروغ ملا ہے۔ زیادہ ذمہ دارانہ رویے سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ پاکستان میں سماجی میڈیا کے ساتھ بڑی حد تک نرمی اختیار کی گئی ہے۔ اس آزادی کو ذمہ داری کے ساتھ برداشت اور امن کی خاطر استعمال نہیں گیا۔

دہشتگرد اور سماجی میڈیا
ماخذ: http://1.bp.blogspot.com/_PG3ew_iFi3A/S8i1-v: ۲۸ اپریل، ۲۰۱۱

دہشت گرد تنظیموں نے خاص طور پر سماجی میڈیا کو مؤثر طور پر استعمال کیا ہے اور اسے دہشت پسندانہ ایجنڈے کی ترویج کے ساتھ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنے مقاصد کے حق میں دلائل دینے کی خاطر استعمال کیا گیا ہے اور اس کی مدد سے خاص طور پر بلاگنگ اور پاڈ کاسٹنگ کے ذریعے زیادہ حاضرین کو متوجہ کرنے میں مدد ملی ہے۔ اس قسم کے میڈیا کی مدد سے، ایسی مذہبی تنظیموں کو اپنے آرڈیننس کے ساتھ زیادہ رابطے کا موقع فراہم ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کو اپنے ٹارگٹ گروپ کا ساتھ اطلاعات کے تبادلے کا موقع بھی فراہم ہوا ہے۔

دہشت گرد تنظیمیں سماجی میڈیا کو استعمال کر کے اپنے پروپیگنڈے کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سماجی میڈیا نے انہیں ممکنہ مددگار عناصر تک نہایت آسانی سے پہنچنے کیلئے اپریشنل اور تکنیکی مدد فراہم کی ہے۔ بلاگ کے اندر مباحثے میں شریک لوگ دہشت

گردی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک فعام بلاگر کے طور پر میرے تجربے میں آیا ہے کہ آزاد ذہن کی ترویج کو فعال سماجی میڈیا کی ویب سائٹس پر روکا جاتا ہے۔ اور یہ کام مذہبی تنظیموں کا سٹاف مخالفانہ دلائل دے کر کرتا ہے۔ ملک میں آزاد آوازوں کو مذہبی تنظیموں کے استعمال کنندگان فعال سماجی میڈیا کو کام میں لاکر دبا دیتے ہیں۔

بلاگ سیفئیر پر اس کاروائی کا ایک جیسے انٹرنیٹ پروٹوکول (IP) پر مختلف ناموں کا استعمال دیکھ کر پتا چلایا جاسکتا ہے۔ پاکستان میں ایسے منظّم بلاگر ہیں جو لبرل بلاگنگ ویب سائٹس کو الگ کر دیتے ہیں اور لبرل عناصر کو سخت اور منطقی بحث کے ذریعے کاؤنٹر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک صارف کے طور پر میں نے کئی بار مشاہدہ کیا ہے کہ ایک ہی IP ایڈریس سے بلاگ ویب سائٹس پر زیادہ بلاگر نمودار ہوتے ہیں اور شدت پسند عناصر کی حمایت کر کے شدت پسندی کی ترویج کرتے ہیں۔

بلاگنگ سے ہٹ کر دہشت گردوں کے انٹرویوز اور کانفرنسوں کیلئے پاڈ کاسٹ کا استعمال بھی بہت زیادہ ہے۔ ایک عسکریت پسند لیڈر اپنے وفاداروں کو ایک مختصر ویڈیو کلپ انٹرنیٹ پر اپ لوڈ کر کے مخاطب کرسکتا ہے۔ مفید بات یہ ہے کہ تبصرے کی صورت میں فوری طور پر فیڈ بیک بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

شہریوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ شدت پسند سماجی میڈیا کی ترقی کا انحصار آسان رسائی، لچک اور اطلاعات کے تبادلے پر ہے۔ تاہم اس حقیقت کو جاننا ضروری ہے کہ اس ترقی پر کچھ لاگت آتی ہے۔ ٹیکنالوجی کی پیشرفت کے ساتھ زندگی میں آسانی اور کاروبار میں اضافہ ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمارا دشمن پاکستان کو نقصان پہنچانے کیلئے ان چیزوں کا استعمال کر رہا ہے۔

بلاشک وتردید لبرل ادارے بھی سماجی میڈیا کی طاقت کو استعمال کر رہے ہیں۔ تاہم وہ دہشت گرد تنظیموں کی طرح اس کا استعمال نہیں کر پا رہے۔ لبرل عناصر سماجی میڈیا کو دو وجوہات کی بناء پر کم استعمال میں لا رہے ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ دہشت گرد تنظیمیں نہایت منظّم اور متواتر طریقے سے سماجی میڈیا کو زیادہ عسکریت پسند بھرتی کرنے اور لوگوں کو اپنے مقصد کی طرف متوجہ کرنے کیلئے اپنے زیر اثر کرتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دائیں بازو کے ادارے سماجی میڈیا پر اس لیے قبضہ جمائے ہوئے ہیں کہ ہم جیسے لبرل عناصر درست اور غلط کی تفریق میں الجھے رہتے ہیں۔ ہم ہمیشہ قانون کے دائرے میں رہ کر اور اصولوں کے مطابق کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے ہمارے اعمال ایک حد کے اندر رہتے ہیں۔ اور کسی کو بطور اصول تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے۔ جبکہ دہشت گرد تنظیموں کیلئے اس طرح کی حدود وقیود نہیں ہوتیں اور وہ اپنے مقصد کو جائز یا ناجائز ذریعے سے حاصل کرنے کے علاوہ کسی دوسری چیز کو خاطر میں نہیں لاتے۔

حاضرین کے ساتھ تیز رفتار اور آزادانہ رابطے کی وجہ سے سماجی میڈیا غیر مرئی دشمن کا پسندیدہ ہتھیار بن چکا ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ نہ صرف دہشت گردی کے خلاف پالیسی بنائی جائے بلکہ ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جو لبرل عناصر کو سماجی میڈیا میں زیادہ جگہ حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کرے۔ لبرل عناصر سماجی میڈیا میں فعال ہیں مگر انہیں ملک کے تمام گوشوں سے ویب پر شدت پسندی کے خاتمے کیلئے مدد کی ضرورت ہے۔

دہشتگرد جماعتوں کا سماجی میڈیا کا منظّم استعمال

ماخذ: http://sheryl-lim-robrigado.blogspot.com/2009_11_01_archive.html

۲۸ اپریل، ۲۰۱۱

پر امن اور اعتدال پسند پاکستان کی خاطر سماجی میڈیا پر لبرل خیالات کی ترویج ضروری ہے اور اس سے تمام شہری آزادانہ طور پر ذمہ داری کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں گے۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجیے:
info@individualland.com

انڈیویجوئل لینڈ اس مضمون کیلئے مصنف کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

واقعات کی رپورٹ:

مسلح جھگڑوں کی صورت احوال میں میڈیا کے کردار کے بارے میں گول میز کانفرنس

مسلح جھگڑے اہم ہیں، خصوصاً جب ان کے اثرات دور تک پھیل جائیں تو ان کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں موجودہ جھگڑوں کا آغاز 9/11 کے واقعہ کے بعد ہوا۔ تاہم، شروع میں یہ جھگڑے پاکستان کے قبائلی علاقوں تک محدود تھے، جہاں عام طور پر یہ تصور کیا جاتا تھا کہ وہاں القائدہ اور طالبان کی قیادت چھپی بیٹھی ہے۔ باقی ماندہ ملک اس صورت احوال سے اس وقت تک بے خبر تھا جب تک کہ قبائلی علاقوں میں لڑی جانے والی یہ جنگ ملک کے دیگر حصوں تک نہیں پہنچ گئی۔

میڈیا جنگ سے منسلک واقعات کی رپورٹنگ میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تاہم، کچھ حلقوں کی یہ رائے ہے کہ میڈیا کبھی کبھار حقائق چھپا لیتا ہے اور اس طرح عوام کو حقیقت سے دور رکھا جاتا ہے۔ 'مسلح جھگڑوں کی صورت احوال میں میڈیا کے کردار' کے بارے میں تفصیلی تبادلہ خیال کا آغاز کرنے کے لئے انڈ ویجوئل لینڈ پاکستان نامی ایک غیر منافع بخش ادارے نے اس عنوان پر 14 اپریل 2011 کو اسلام آباد کے ایک مقامی ہوٹل میں گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ تھنک ٹینکس، ریسرچ اداروں، میڈیا گروپس، تعلیمی اداروں اور سول سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے انفرادی لوگوں نے اس تقریب میں شرکت کی۔

پاکستان ٹرائیبل یونین آف جرنلسٹس کے سینئر نائب صدر جناب وحید آفریدی نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے بنیادی سطح پر موجود صحافیوں کو درپیش مسائل بیان کئے۔ انہوں نے ان حالات پر روشنی ڈالی جن میں صحافیوں اور رپورٹروں کو کام کرنا ہوتا ہے۔ انہوں نے ان خطرات کا بھی ذکر کیا جو ایک جنگ زدہ علاقے میں رپورٹنگ کرنے میں رپورٹرز کو پیش آتے ہیں۔ ایک رپورٹر کو نہ صرف دہشت گردوں کے جانب سے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات مسلح افواج ان پر اپنی رپورٹوں میں اپنے مطلوبہ نکات کی عکاسی کرنے کے لئے زور ڈالتی ہیں۔ انہوں نے صحافیوں کے کام کو سیکورٹی فراہم کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ آج کل، رپورٹروں کی ایک بڑی تعداد کمیشن پر کام کرتی ہے یعنی ہر اس خبر پر جو چھپ جاتی ہے انہیں کمیشن ملتا ہے اور انہیں کوئی طے شدہ تنخواہ نہیں دی جاتی۔ کچھ رپورٹر تو کسی دستخط شدہ سمجھوتے کے بغیر ہی میڈیا گروپس کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

دی نیوز کے سینئر صحافی اکرام ہوتی نے کہا کہ ان کے خیال میں ایک مقامی ان دیکھا ہاتھ پاکستان میں موجودہ جنگی حالات کا ذمہ دار ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں قبائلی علاقوں میں جاری جنگ کے واقعات کی سیریز کے پیچھے لوگ دراصل ''شیطان کا بھیس'' دھارے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ قبائلی علاقوں کی مناسب حد بندی نہیں کی گئی۔ انہوں نے کہا کہ موجود جنگ میں چار فریق ملوث ہیں یعنی عملی کردار ادا کرنے والے، انہیں سہولت فراہم کرنے والے، منصوبہ بندی کرنے والے، اور جوڑ توڑ کرنے والے۔

آج کل پاکستان ٹوڈے سے منسلک سینئر صحافی شمیم شاہد نے کہا کہ جنگ زدہ علاقوں کے حوالے سے میڈیا کا کردار متضاد اور منفی ہے۔ انہوں نے اپنے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ میڈیا درست اور غلط میں تمیز کرنے میں ناکام ہو گیا ہے۔ انہوں نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں جنگی صورت حال کے بارے میں تمام سیاسی اسٹیک ہولڈرز کی جانب سے ایک متفقہ فیصلہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے 1970 کی دہائی میں بنائی جانے والی جنگی حکمت عملی کی پالیسیوں کو بھی اس صورت حال کا ذمہ دار قرار دیا۔

سماء ٹی وی کے سابق بیورو چیف اور آج کل کوئٹہ میں پاکستان ٹوڈے سے منسلک صحافی شہزادہ ذوالفقار نے میڈیا کی آزادی کے حوالے سے سوال اٹھایا۔ انہوں نے کہا کہ میڈیا کی آزادی کو ہمیشہ احتساب سے منسلک ہونا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر میڈیا گروپس کو عوام کی نظروں میں قابل اعتبار بننا ہے تو پھر انہیں احتساب پر توجہ دینی چاہیئے۔ انہوں نے کچھ مثالیں دیں کہ کس طرح میڈیا عوام کے سامنے حقیقی تصویر پیش کر سکتا ہے، کیوں کہ وہ اصل حقائق سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔

ماضی میں دی نیشن سے منسلک اور آج کل آج ٹی وی سے وابستہ سینئر صحافی جناب ابصار عالم نے معاشرے میں ایک نہایت سنگین مسئلے کی نشان دہی کی۔ انہوں نے کہا کہ عام آدمی کسی بھی غلط حرکت پر سول سوسائٹی اور میڈیا کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔ یہ رویہ ہرگز حوصلہ افزا نہیں ہے۔ انہوں نے میڈیا کو زیادہ ذمہ دار بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں اس بات

کی بھی نشان دہی کی کہ محض زیادہ رقم کمانے کے وجہ سے میڈیا پر جھگڑوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔انہوں نے سیاسی پارٹیوں اور کچھ غیر ملکی کرداروں کو جنگی صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔انہوں نے اس بات کی بھی نشان دہی کی کہ معلومات کے صارفین یعنی عام لوگ میڈیا گروپس پر منفی پروپیگنڈہ روکنے کے لئے زور ڈالیں۔

سرچ فار کامن گراؤنڈ کے کنٹری ڈائریکٹر علی سلیم نے یہ کہتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا کہ جب تک جنگ کی بنیادی وجہ پر توجہ نہیں دی جاتی، اسے محدود کرنے میں ہمیشہ مشکلات کا سامنا ہوگا۔انہوں نے پوزیشن پر مبنی کی بجائے دلچسپی پر زیادہ مبنی بات چیت کرنے پر زور دیا۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ سیاسی عمل شرکت کا ایک ذریعہ ہے، جو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

اسلام آباد ڈیٹ لائن کے رپورٹر عاصم اعوان، جو سیاست، پارلیمانی اور وزارت خارجہ کے امور دیکھتے ہیں، نے جناب ابصار عالم کے موقف کی حمایت کی۔انہوں نے کہا کہ میڈیا ہر ایک کے لئے ہے، کیوں کہ یہ ہر ایک کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔تاہم، جنگی صورت حال کو دو مختلف انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔پہلے، یہ کہ ایک جنگی صورت حال موجود ہے جس میں حکومت، غیر حکومتی عناصر سے برسر پیکار ہے اور دوسرے یہ کہ شاید یہ دو مختلف ممالک کی فوجوں کے درمیان ایک فوجی جھگڑا ہے۔

آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ کے ڈائریکٹر سوسائٹی جناب مظہر عارف کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سرکار کا ایجنڈہ میڈیا کا ایجنڈہ ہے، جو عوامی ایجنڈہ بن جاتا ہے اور پھر یہ پالیسی ایجنڈے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔میڈیا زیادہ تر کسی ایلیے کو فروخت کرنے پر توجہ دیتا ہے۔انہوں نے بلوچستان کی مثال دی جسے میڈیا نے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔انہوں نے کہا کہ اب عام طور پر بلوچ عوام کے نمائندے ٹی وی اسکرین پر نظر نہیں آتے۔میڈیا کو چاہیئے کہ وہ لوگوں کے لئے صارفین دوستانہ چیزیں پیش کرے۔تاہم مخصوص قسم کی نیوز رپورٹس تیار کرنے میں پیسے اور محاصل اکٹھے کرنے کا عنصر پوشیدہ ہوسکتا ہے۔

انٹر میڈیا کے کنٹری ڈائریکٹر جناب عدنان رحمت نے اپنی بحث کا یہ کہتے ہوئے آغاز کیا کہ دہشت گردی ایک طویل عرصے سے میڈیا کی توجہ کا حامل رہی ہے۔یہ بات ذہن میں رکھنا اہم ہے کہ جنگ جو، زیادہ تر ایسے علاقوں میں کارروائی کرتے ہیں جہاں میڈیا کی موجودگی یقینی ہو، لہٰذا آزاد میڈیا عوام کے لئے خوف کے میڈیا میں تبدیل ہوسکتا ہے۔''مناواں پولیس ٹریننگ اسکول'' اور ''جی ایچ کیو راولپنڈی'' پر ہونے والے حملوں کا وقت اس انداز میں ترتیب دیا گیا تھا کہ میڈیا فوری طور پر متوجہ ہو سکے۔حکمت عملی یہ تھی کہ لوگوں میں زیادہ سے زیادہ خوف پیدا کیا جائے، کیوں کہ اگر مسلح افواج اور پولیس پر حملہ ہوسکتا ہے تو عام لوگوں کے لئے اپنے تحفظ کو یقینی بنانا مشکل ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ فاٹا معلومات کا ایک بلیک ہول

انڈیوجول لینڈ کے سینئر پروگرام منیجر میاں اعتصام وحید گول میز کا انعقاد کرتے ہوئے۔

ہےاوروہاں پرکام کرنے والا زیادہ تر میڈیا جنگ جومیڈیا ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) قانون کے تحت قبائلی علاقوں میں پبلی کیشنز پر پابندی لگادی گئی ہےاورزیادہ تر رپورٹنگ بیرونی عناصر کرتے ہیں۔انہوں نے میڈیا کے لئے اخلاقیات پرعمل کرنے کی ضرورت پربھی زور دیا۔

پشاور یونیورسٹی کے محکمہ صحافت سے تعلق رکھنے والے اورڈان گروپ کے کالم نگار جناب سید عرفان اشرف نے کہا کہ میڈیا سوسائٹی کا ایک اہم حصہ ہے۔شدت پسندی شاید سب سے بڑا ایک ایسا مسئلہ ہے جوآج معاشرے کودرپیش ہے۔صحافیوں اور رپورٹروں کے لئے کام کرنے کے حالات قطعی حوصلہ افزانہیں ہیں۔بدقسمتی سے، دہشت گردی کے خلاف جنگ اورمیڈیا بوم ایک ہی وقت میں عروج پرآئے ہیں جس کے وجہ سے پاکستانی میڈیا کوایک مخصوص رنگ ملا ہے۔انہوں نے جنگ زدہ علاقوں میں رپورٹروں اورصحافیوں کی تربیت اور مناسب تعلیم پرزور دیا۔انہوں نے مزید کہا کہ جب ایک غیرتربیت یافتہ صحافی جنگ زدہ علاقے میں بھیجا جاتا ہے جس کی بھاگ دوڑ دفتر میں بیٹھے ہوئے کسی فرد کے ہاتھ میں ہوتی ہے،تو اس سے غیرمتعصب رہنے کی کس طرح امید رکھی جاسکتی ہے۔انہوں نے کہا کہ مقامی مسائل کومقامی طور پرحل کرنے کی ضرورت ہے۔

ریٹائرڈ سفیر جناب ایاز وزیر نے بحث کوسمیٹتے ہوئے صرف ان واقعات کی رپورٹنگ کرنے کی بجائے جنہیں کہ آسانی سے فروخت کیا جاسکتا ہے،حقیقی مسائل پرتوجہ دینے پرزور دیا ۔لوگ مویشیوں،فصلوں،باغوں اور بہت سے دیگر چیزوں سمیت ان جنگوں میں بہت کچھ کھو چکے ہیں۔عوام کے سامنے اپنے تصور کوبہتر بنانے کے لئے میڈیا کوان مسائل پرتوجہ دینی چاہیئے۔

مجموعی طور پراس بحث نے میڈیا کے مختلف گروپوں کے ساتھ کام کرنے والے میڈیا کے ملازمین کوملِ بیٹھنے اورمیڈیا کے موجودہ مسائل کی عکاسی کرنے کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم فراہم کیا۔اس بات پراتفاق کیا گیا کہ مسلح جھگڑوں کی صورت احوال میں میڈیا کے کردار کوبہتر بنانے کے لئے،صحافیوں اور رپورٹروں کوملازمت کی سیکورٹی اورتحفظ فراہم کرنا ضروری ہے،تاکہ جب وہ اپنے کام میں مصروف عمل ہوں توان مسائل کے بارے میں فکرمند نہ ہوں۔

ادارے سے آگاہی

انڈوبجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش درج شدہ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔ اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

اس ادارے کو بنیادی طور پر اس کے ممبران اور ٹرسٹیز فنڈز فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر پراجیکٹس کے ڈونرز اور کلائنٹس بھی فنڈز فراہم کرتے ہیں۔ ہمارے بین الاقوامی پارٹنرز میں اوپن سوسائٹی انسٹی ٹیوٹ، کامن ویلتھ سکریٹریٹ اور ایشین ڈیولپمنٹ بینک کا بھی شمار ہوتا ہے۔

انڈوبجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔ اس حوالے سے اس ادارے کا دونوں اطراف سے گہرا تعلق ہے اور اسی بناء پر سول سوسائٹی اور پارلیمان سے تعلق رکھنے والے افراد کے تعلقات کی مضبوطی اور بڑھاؤ کے لئے بہت سے اقدامات بھی کر چکا ہے۔ انڈوبجوئل لینڈ کے صوبہ بلوچستان اور خیبر پختونخواہ میں بھی گہرے مراسم ہیں جو اسے کئی اعتبار سے مدد فراہم کرتے ہیں۔

اشاعت

حکومت اور احتساب

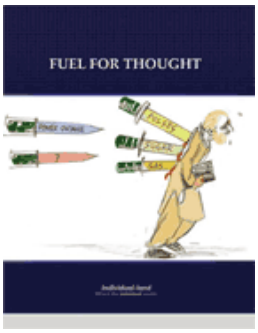

میڈیا سے متعلق

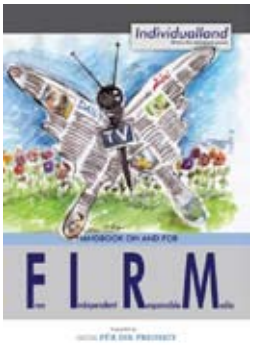

اقتصادیات

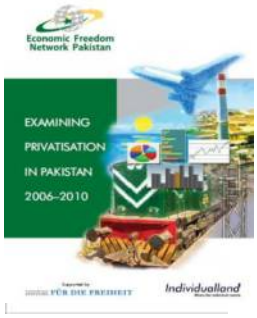

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

اگلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۱ میں

http://individualland.com/firm-blog/
info@individualland.com
www.individualland.com